فلسفۂ جمال

ریاض الحسن - ایم - اے

الہ آباد

ہندستانی اکیڈیمی، یو۔ پی

۱۹۳۵

فہرست مضامین

فلسفۂ جمال

انسان کی سرشت میں مختلف قسم کی صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں وہ جن سے حسب ضرورت کام نکالتا ہے مثلاً پیاس لگتی ہے تو پانی کے لئے دوڑتا ہے ' سردی لگتی ہے تو کپڑے کی فکر کرتا ہے اور اگر کوئی حملہ کرتا ہے تو اس کے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے وغیرہ وغیرہ - ان افعال میں ایک فائدہ ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو یک گونہ سکون ہوجاتا ہے - لیکن ایک صلاحیت ایسی بھی ہے جس کو فائدہ سے کوئی واسطہ نہیں غرض سے کوئی تعلق نہیں - اس کے اثر سے انسان ایسی حرکات کرتا ہے جس کو اصطلاح میں "بیکار" کہہ سکتے ہیں یعنی اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا ' نہ سود کی تمنا اور نہ زیاں کی پرواہ ہوتی ہے کیونکہ انسان اس وقت عالم خارجی کو اپنے دل میں چھپا لینے کی خواہش کرتا ہے اور اس میں اس کو روحانی مسرت ملتی ہے ' سرور ملتا ہے اور یہی سرور ان حرکات کا سب سے بڑا صلہ ہے -

دریا کے کنارے شام کی شفق کا عکس جب پانی میں دیکھتا ہے تو صبر و قرار کھو بیٹھتا ہے یا کبھی موسم بہار کی کسی رنگین صبح کو جب صبا کی مست خرامی کے ساتھ نونہالان چمن کو ایک طرف مصروف رقص اور دوسری طرف غنچہ و گل کو خنداں و متبسم دیکھتا ہے تو بے اختیار ہو جاتا ہے - کبھی ایک نامعلوم جذبہ سے بیتاب ہوکر ابر شفق آلودہ کو اپنے ہی دل کا خون ہونا سمجھتا ہے اور کبھی بلبل کے نغمیں میں

اپنا ھی نالۂ درد سنتا ھے - اس وقت دل میں ایک خلش محسوس کرتا ھے جس سے خود دل کو لطف ملتا ھے اور اس کیفیت کے ماتحت وہ ھر اس شے کو جس کی طرف اس کی طبیعت راغب ھوتی ھے "حسین" کہتا ھے - یہ حسین کیا اور حسن کیا ھے ؟

والٹر پیٹر کا قول ھے کہ حسن کی جامع تعریف نا ممکن ھے کیونکہ حسن محض ایک انفرادی کیفیت کا نام ھے جس سے عام قیاس نہیں کیا جاسکتا ھے - لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف عام میں کتنی ھی چیزیں حسین کہی جاتی ھیں - مثلاً صحن چمن میں روے گل کو کون حسین نہیں کہیگا - پھر دریا کا پر فضا کنارہ ، شام کی شفق ، صبح کا روے خنداں ، کہسار کا دلفریب نظارہ ، باغ کی بہار - ایک چابکدست مصور کا شاھکار - ایک مشہور سنگتراش کا مجسمہ وغیرہ - غرض کتنی ھی ایسی چیزیں ھیں جن سے حسن کا خیال وابستہ ھے - تو کیا حسن ان اشیاء میں خارجی طور پر پہلے سے موجود ھے یا ھمارے جوش تخیل و شدت احساس کا نتیجہ ھے ؟

حسن اور تخیل

ھم جب کسی 'حسین' چیز کو دیکھتے ھیں تو اس کا اثر پہلے ھمارے حواس پر پڑتا ھے - پھر دل ایک کشش محسوس کرتا ھے اور جب اس کشش کے ماتحت ھم اپنے احساس اور خارجی منظر میں یگانگت پیدا کر دیتے ھیں تو ھم کو مسرت ھوتی ھے - یہ یگانگت تخیل سے پیدا ھوتی ھے - تخیل روح کا ایک فعل ھے جس کی مدد سے روح اپنی پوری آزادی کے ساتھ اپنے پرانے تجربوں کو زندہ کرتی ھے اور احساس کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں کا جائزہ لیتی ھے - روح کا یہ فعل حواس سے شروع ھوکر تخیل و تفکر پر ختم ھوتا ھے مثلاً باغ کی

ٹھنڈی ہوا ' جنگل کا پر سکون منظر ' کوئل کی کوکو ' مصوری کا ایک عمدہ نمونہ وغیرہ یہ چیزیں جب آپ کے سامنے آتی ہیں تو پہلے حواس پر اپنا اثر کرتی ہیں - پھر آپ ان سے بقدر تخیل محظوظ ہوتے ہیں اور ان کو ' حسین ' کہنے لگتے ہیں - اگر آپ کا تخیل بلند ہے تو آپ کے احساس میں اور شدت پیدا ہوجائیگی - مثلاً جب آپ کے سامنے غالب کا یہ شعر پڑھا جائے -

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

تو آپ صبح کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ برگ گل پر قطرۂ شبنم کا خیال کریں گے ' پھر سورج کی کرنوں کے اثر سے شبنم کا اڑ جانا یا فنا ہونا آپ کے ذہن میں آئیگا - جس طرح شبنم کا قطرہ غائب ہوجاتا ہے اسی طرح آپ اس عالم فانی سے جو چمن کے مانند ہے کسی بلند ہستی کی ' عنایت ' سے زندگی کے آخری سفر پر غور کرکے لطف اٹھائیں گے - آپ یہ چیزیں دیکھ نہیں رہے ہیں مگر تخیل چشم زدن میں یہ سارا نقشہ آپ کے سامنے لاکر رکھ دیگا - اُس وقت یقیناً آپ پر ایک روحانی مسرت کی کیفیت طاری ہوگی جس کو ہم جذبۂ حسن کی بیداری سے تعبیر کرسکتے ہیں - معلوم ہوا کہ حسن ایک روحانی کیفیت کا نام ہے جو حواس ' تخیل اور تفکر کے باہمی امتزاج سے مترتب ہوتا ہے -

حواس پر جو چیز اثر کرتی ہے ہم کو اس کے فائدہ یا نقصان سے کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ ہم کو صرف اس کی ظاہری صورت سے مطلب ہوتا ہے - ہم گلاب کو اس نیت سے نہیں دیکھتے کہ اس کی جڑ میں

کون سی کھاد پڑی ھے یا اگر فلاں قسم کی مٹی بہم پہونچائی جائے تو پھول اور بڑا ھوگا اور اس سے زیادہ عرق نکلے گا بلکہ اس کی ظاھری صورت سے بغیر کسی سود و زیاں کے خیال کے متاثر ھوتے ھیں اور اس کی نرم و نازک پتیوں میں اپنے دل صد چاک کی داستان پنہاں دیکھتے ھیں اور مسرور ھوتے ھیں - بادل کو لیجئے - ہم تو صرف بادلوں کی رنگینی ' اور ان کی مختلف اشکال کا جلوہ دیکھتے ھیں اور خوش ھوتے ھیں - ہم کو اس سے کیا بحث کہ ان میں پانی کے قطرے چھپے ہوئے ھیں اور ایک خاص درجۂ رطوبت پر وہ زمین کو سیراب کرتے ھیں - ہم کو تو ان کی ظاھری صورت ھی میں لطف ملتا ھے جو ہم نے اپنے تخیل سے قائم کی ھے - لطف و انبساط کی اس کیفیت کا نام احساس جمال ھے - ایک خاص بات اس احساس میں یہ ھوتی ھے کہ اس کا ایک گوشہ ھمیشہ اشیاء محسوسہ سے ملا ھوتا ھے - جیسے سمندر میں کہرے کی کیفیت ھوتی ھے کہ باوجود بلند ھونے کے سطح آب سے ملا ھوتا ھے اسی طرح احساس جمال باوجود بلندی تخیل کے خارجی شے سے ملا ھوتا ھے کیونکہ تحریک ھمیشہ خارجی اشیاء سے پیدا ھوتی ھے - مان لیجئے کہ آپ کسی وجہ سے رنجیدہ ھیں تو آپ دل پر ایک بوجھ محسوس کرینگے ' ایک خلش رہ رہ کر آپ کو پریشان کریگی اور جس چیز سے آپ کو یہ تکلیف پہونچی ھے وہ برابر آپ کے ذھن میں رھیگی - اس تکلیف میں آپ کا احساس معمولی درجہ کا ھوگا لیکن اگر اس درد کی حالت میں تخیل نے آپ کو چھوڑ دیا تو آپ سراپا درد بن جائیں گے - احساس شدید اور تیز ھوجائیگا اور آپ کے دل پر نئی نئی کیفیتیں طاری ھوں گی - وہ رنج و غم اب بالکل ایک دوسری صورت میں نظر آئے گا اور اس میں نئے نئے معانی اور مطالب پیدا ھوجائیں گے - اقبال نے ' والدہ مرحومہ کی یاد میں ' ایک

مرثیہ لکھا ہے - اول اول والدہ مرحومہ کے غم میں اقبال کی آنکھیں اشکبار ہیں پھر ان کو اپنا عہد طفلی اور مادر مرحومہ کی تربیت اور شفقتوں کا خیال آتا ہے تو نشتر غم کی نوک خاصی تیز ہوجاتی ہے -

تجھ کو مثل طفلک بیدست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

لیکن جب تخیل اقبال کو ایک بلند مقام پر لیجاتا ہے جہاں موت و حیات کی عالمگیر حقیقت اور کائنات کے قوانین پر نظر ہوتی ہے تو درد و اثر اور بڑھ جاتا ہے - جو خیال اول والدہ مرحومہ کی یاد سے پیدا ہوا تھا اب وہ سارے عالم پر چھا گیا -

آہ ! یہ دنیا ' یہ ماتم خانہ برنائ پیر
آدمی ہے کسی طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
زلزلے ہیں ' بجلیاں ہیں ' قحط ہیں ' آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں ' دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
نے مجال شکوہ ہے ' نے طاقت گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

زندگی کی داستان کے بعد ذرا موت کی حقیقت بھی سن لیجئے :—

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ' یہ وہ گوہر نہیں

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

اسی طرح خزاں میں پتیوں کے گرنے اور بہار میں نئی نئی کونپلوں کے نکلنے کو سب دیکھتے ہیں لیکن جوش تخیل سے شاعر اسی چیز میں معنی پیدا کرتا ہے اور اس عالم کے انقلاب کی داستان بیان کرتا ہے - اکبر کا شعر ہے :—

بہار آئی خزاں آئی خزاں آئی بہار آئی
سدا ہم نے بدلتا رنگ دیکھا اس گلستاں کا

آتش کا شعر :—

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

یا انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا یہ مصرع :—

آتی ہے خزاں تو آنے دو پر ہم سے بہار اب دور نہیں

نہ صرف موسمی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ زندگی نام ہے انقلاب کا تغیر کا اور زمانہ کے بدلنے کا -

جب ہم کسی خارجی شے کو دیکھتے ہیں تو تخیل بہ‌تقاضاے انبساط ایک ایسا خیالی ہیولا قائم کردیتا ہے جس کی بنیاد اسی خارجی شے پر ہوتی ہے - یہ ہیولا جیسا میں بتا چکا ہوں سمندر کے کہرے کی طرح اپنی بنیاد سے علیحدہ بھی ہوتا ہے اور ملا ہوا بھی - علیحدہ اس صورت سے کہ یہ خارجی شے نہیں ہے اور ملا اس صورت سے کہ خارجی شے کے اثر سے پیدا ہوا ہے - یہ خیالی ہیولا گویا روح کا ایک عکس ہے جو خارجی اشیاء پر پڑتا ہے اور چونکہ یہ روح ہی کا ایک عکس ہے اس لئے

روح کی تمنائیں اور آرزوئیں اس ہیولا میں نظر آتی ہیں - روح اس ہیولا کا تصور کرکے مسرور ہوتی ہے - روح کو ایک ایسے عالم کی تلاش ہوتی ہے جہاں اس عالم آب و گل کی ناکامیاں اور بے عنوانیاں موجود نہ ہوں - جہاں شمع کا سوز پروانہ کو بیقرار نہ کرتا ہو - جہاں تکلیف و آرام کا قانون ہی کچھ اور ہو - جہاں زہر کی تلخی اور کانٹے کی چبھن محسوس نہ ہو - جہاں اشیاء اور ماحول میں بجائے تخالف و تنازع کے یکجہتی اور ہم آہنگی ہو - ظاہر ہے کہ یہ منظر اس چتر نیلگوں کے نیچے کہیں نہیں مل سکتا مگر اس کے باوجود روح کو اس کی آرزو اور تلاش رہتی ہے اور اس تلاش میں وہ سر گردان رہتی ہے - آخر اس عالم کی بےعنوانیاں سے متاثر ہوکر وہ ایک عالم مثال جو سراسر تخئیلی ہوتا ہے تلاش کرلیتی ہے - وہاں ہر چیز عالم آب و گل سے مختلف ہوتی ہے - وہاں دشمنی اور عداوت کے بجائے ایثار و محبت کا سکہ چلتا ہے اور وہاں کا قانون روح کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے - چونکہ اس عالم مثال یا تخئیلی ہیولا میں روح کی خواہشیں اور آرزوئیں پوری ہوتی ہیں اس لئے اس ہیولا کا تصور روح کو مسرور کرتا ہے - اس حالت میں روح اور ہیولا دو علحدہ چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی چیز ہوتی ہے - مگر واضح رہے کہ اس عالم مثال کا تصور اس عالم آب و گل ہی کی بنیاد پر قائم ہے - اس لحاظ سے اس ہیولا میں جو روح کا ایک خارجی عکس ہے بہ‌یک وقت خارجی اشیاء، تخئیل اور تصور کی کیفیات موجود ہوتی ہیں اور اسی ہیولا کا نام حسن ہے - جمالیات کی اصطلاح میں اس کو جمالیاتی اظہار کہتے ہیں کیونکہ روح خود اپنی خواہش جمال کو ایک خیالی ہیولا کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے - اس ہیولا کا اظہار جب رنگ، صورت یا آواز میں ہوتا ہے تو اس کو فن یا آرٹ کہتے ہیں -

اس تخئیلی هیولا کے تین جزو ہوتے ہیں - اول خارجی اشیاء پر تخیل کا اثر ہونا دویم اس ہیولا پر تصور یا تفکر کا عمل ہونا اور سوئم اس تخئیلی هیولا میں معنویت اور قدر کا پیدا ہونا - تخیل اور تصور کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہیولا میں قدر کہاں سے آتی ہے - قدر درحقیقت ہیولا میں نہیں ہوتی بلکہ روح خارجی شے کی مدد سے خود قدر کی تخلیق کرتی ہے - ساز کے مختلف تاروں سے جو نغمے نکلتے ہیں ان سے ایک انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے - یہ کیفیت یا قدر بالکل روحانی چیز ہے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساز ہی سے خوشی و مسرت کا چشمہ ابل رہا ہے - بات یہ ہے کہ خارجی شے اور تخیل میں جیسا میں نے کہا ہے ایک طرح کا اتحاد ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نغمہ کا یہ کیف تاروں ہی سے نکل رہا ہے اور جب یہ اتحاد شکست ہو جاتا ہے تو وہ کیفیت بھی غائب ہو جاتی ہے - ہم کو نغموں میں کیوں لطف ملتا ہے ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہماری روحانی خواہش اور رجحان کو اس سے تسکین ہوتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ نغمہ میں قدر پوشیدہ ہے -

حسن کے اجزاے سہ گانہ

ارباب علم نے قدر کے تین نظریئے بیان کئے ہیں - اول یہ کہ قدر خود اشیاء کی صفت ہے اور یہ صفت بغیر روح کے احساس کے اس کے اندر موجود ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ شفق میں خود حسن موجود ہے - دریا کی روانی خوبصورت ہے اس لئے دل اس طرف کھنچتا ہے - لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں کیونکہ روح میں احساس کا ملکہ نہ ہو تو پھر دنیا کی کون سی چیز حسین ہونے کا دعوی کر سکتی ہے ! دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قدر سراسر ایک روحانی فعل ہے اور محض روح ہی اسکی خالق ہے - یہ نظریہ بھی درست نہیں کیونکہ ہم خارجی اشیاء کی طرف

راغب ہوتے ہیں' اِن سے محظوظ ہوتے ہیں' لطف اُٹھاتے ہیں اور انہیں حسین کہتے ہیں - تیسرا نظریہ یہ ہے کہ قدر ایک اضافی چیز ہے جو روح اور خارجی اشیاء کے آپس میں اتحاد سے پیدا ہوتی ہے یعنی قدر تنہا کسی غیر ذی روح اشیاء میں ہوہی نہیں سکتی بلکہ یہ نام ہے ایک روحانی فعل کا جو کسی خارجی شے کی تحریک سے پیدا ہوا ہے - دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قدر کی حیثیت کل کی ہے جس سے روح اور خارجی اشیاء میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے -

قدر کی دو قسمیں ہیں - ایک جسمانی دوسری روحانی - روحانی قدر یقیناً جسمانی قدر سے اونچے درجے کی ہوتی ہے اور اعلیٰ قدر یہی ہے - جسمانی قدر کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ آپ کو پیاس لگی ہے - اندر سے ایک طرح کی خواہش پیدا ہوئی اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے طبیعت بے چین ہے - مان لیجئے کہ آپ نہیں جانتے کہ پیاس کا علاج پانی ہے یا پانی میں پیاس بجھانے کی صلاحیت موجود ہے - اس حالت میں آپ کے سامنے کچھ کچے پھل یا اور کوئی چیز رکھ دی جائے تو آپ تجربہ کریں گے مگر آپ کی پیاس نہ جائیگی - پھر آپ کے سامنے ایک رقیق سیال چیز آتی ہے - آپ اسے پی جاتے ہیں اور پیتے ہی ایک طرح کی مسرت اور تسکین محسوس کرتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے نہ ہوتی - آپ سمجھتے ہیں کہ پانی میں قدر موجود ہے لیکن در اصل پانی میں کوئی قدر نہیں- قدر تو آپ کی خواہش کے پورا ہونے میں ہے یعنی خواہش اور چیز دونوں کی ہم آہنگی میں - یہ تو جسم کا حال ہوا مگر یہی حال روح کا بھی ہے - روح کو بھی پیاس لگتی ہے - خواہش ہوتی ہے - اس کو بھی خورد و نوش کی ضرورت ہوتی ہے - مگر اس کی خورد و نوش کی صورت

دوسری ھے - مثلاً روح کو بلندی کی خواھش ھوتی ھے یعنی وہ اپنے ماحول سے بلند ھونا چاھتی ھے - اس کو ایک ایسے عالم کی آرزو ھوتی ھے جہاں پہونچ کر انسان زندگی کے آلام و مصائب کو بھول جائے ' اور جہاں اس زندگی کا راز معلوم و منکشف ھو جائے یہ خواھش شاعری ' مصوری یا موسیقی وغیرہ سے پوری ھوتی ھے - روح اپنی خواھش پرواز کو پورا کرنے کے لئے ایک ذریعہ تلاش کر لیتی ھے - یعنی یہ خواھش بغیر کسی خارجی شے کی مدد کے پوری نہیں ھو سکتی - اس خارجی شے کی بنا پر تخیل ایک ھیولا قائم کرتا ھے اور اس ھیولا میں روح اپنی نا آسودہ تمناؤں اور آرزؤں کی کامیابی محسوس کرتی ھے اور اس کامیابی کے تصور سے مسرور ھوتی ھے - اس لئے صحیح قدر نام ھے صرف اس تعلق کا جو روح کو اپنی تسکین کے لئے کسی خارجی شے کے ساتھہ ھوتا ھے - یعنی قدر ھم خود تخیل کے زور سے خارجی اشیا کے ذریعہ پیدا کرتے ھیں - اس وقت گویا ھمارا باطن ایک خارجی صورت اختیار کر لیتا ھے اور روح خارجی مناظر کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ھے اور ھم یہ سمجھنے لگتے ھیں کہ خارجی مناظر میں حسن ھے ' قدر ھے حالانکہ حسن تو ھم خود پیدا کرتے ھیں - درحقیقت نہ پھول ھنستے ھیں اور نہ شبنم روتی ھے - جب ھم ھنسنا چاھتے ھیں تو ھم کو ھر پھول ھنستا ھوا معلوم ھوتا ھے اور جب رونے کی تمنا ھوتی ھے تو ھر قطرۂ شبنم آنسو کا قطرہ معلوم ھوتا ھے - اس وقت پپیہے کی پی پی میں اپنے ھی فراق و ھجر کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ھے - غالب کا شعر ھے :—

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ھمنے اپنا دل

خوں کیا ھوا دیکھا گم کیا ھوا پایا

غالب کو غنچہ کے کھلنے میں اپنا خون شدہ دل نظر آتا ھے - غنچہ کی شوخي ' اس کی سرخی اور اس کی چاک دامانی کی نہ صرف دل سے مشابہت ھے بلکہ انہوں نے غنچہ کی بنا پر دل کا جو ھیولا اپنے ذھن میں قائم کیا وہ بالکل غنچہ کے اثر سے جاکر مل گیا اور اس اثر سے متاثر ھوکر وہ کہہ اٹھے -

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ھمنے اپنا دل * خون کیا ھوا دیکھا گم کیا ھوا پایا

اور اندرونی کیفیت نے ' غنچہ ' کي شکل میں خارجیت اختیار کر لی - پھر غنچہ میں وہ تمام قدور نظر آنے لگے جو صرف دل کا حصہ تھے حالانکہ بظاھر غنچہ اور دل میں دور کا واسطہ بھی نہیں - اسی طرح موسیقي کی ایک لے میں بظاھر آواز کا زیر و بم سنائی دیتا ھے مگر معلوم ایسا ھوتا ھے کہ دل کی ساری تمنائیں اور دل کا سارا راز اس ایک لے میں شامل ھے - روح ' خارجیت ' کے ساتھ جو رشتہ قائم کرتی ھے اس کی کیا نوعیت ھے ؟ اس کو سمجھنے کے لئے خارجی اشیا کے حسب ذیل پہلوؤں پر نظر رکھنا ضروري ھے -

خارجي اشیا کے دو پہلو

اشیائے مدرکہ جو بظاھر ھمارے حواس پر اول اول اپنا اثر ڈالتی ھیں ان کے دو پہلو ھوتے ھیں اول تو ان کا حسی پہلو جیسے رنگ ' آواز ' خوشبو وغیرہ - دوم ان کا صوري پہلو جیسے خط ' جسم اور راگ وغیرہ - ان دونوں پہلوؤں کو صرف بحث کے لئے علیحدہ کر لیا گیا ھے تاکہ مسئلہ آسانی سے ذھن نشیں ھو جائے ورنہ درحقیقت کسی شے کے ان دونوں پہلوؤں کو الگ کرنا مشکل ھے - پھر ان چیزوں کا ھم پر بلا واسطہ اور بالواسطہ اثر پڑتا ھے - پہلے بلا واسطہ حسی اثر کو لیجئے - بعض اصحاب کا خیال ھے کہ اشیاء کا حسی اثر ھم پر اس وقت تک بالکل نہیں پڑتا جب تک کہ

ان کی کوئی صورت بھی نہ ہو - مثلاً خالی رنگ کوئی چیز نہیں لیکن یہی رنگ جب کسی تصویر میں نمودار ہوتا ہے تو اسمیں قدر پائی جاتی ہے اور دل بے اختیار ایک کشش، ایک جاذبیت محسوس کرتا ہے - یہی بات آواز کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے یعنی محض آواز بے معنی اور بے قدر چیز ہے لیکن جب تال اور سر کے ساتھ ادا کی جائے تو اس میں نغمہ پیدا ہوتا ہے - لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے - اگر رنگ یا آواز کو صرف حسی پہلو سے دیکھا جائے تو اس میں کسی حد تک قدر ضرور شامل ہوتی ہے - یعنی آواز کو اگر نغمہ سے الگ کردیں تب بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا کیونکہ ہمارے اعصاب میں اثر پذیری کا مادہ موجود ہے - مان لیجئے کہ ایک شخص خوش الحانی کے ساتھ بنگالی زبان کی نظم پڑھ رہا ہو - آپ اگر بنگالی زبان سے ناواقف ہیں تو آپ نغمہ کا لطف پوری طور پر نہ اٹھا سکیں گے لیکن جہاں تک صرف آواز کا تعلق ہے آپ پر اس کا اثر پڑیگا اور ممکن ہے آپ محظوظ بھی ہوں - آواز میں کبھی درد ہوتا ہے ' کبھی مسرت اور شگفتگی پائی جاتی ہے ' کبھی بیگانگی و بے مہری کا رنگ جھلکتا ہے - کبھی تلوار کی تیزی نمایاں ہوتی ہے کبھی زہر و تریاق کا اثر پیدا ہوتا ہے - غرض آواز سے کتنے معنی نکلتے ہیں - اسی طرح رنگ کے بھی زبان ہوتی ہے - وہ باتیں کرتے ہیں اور آپ پر اپنا اثر ڈالتے ہیں - گلابی رنگ جذبات کو ابھارتا ہے ' نارنجی دل کو تقویت بخشتا ہے اور سبز مفرح ہوتا ہے لیکن حسی پہلو میں جو قدر پائی جاتی ہے اس میں تلازمہ کا اثر بھی ہوتا ہے - یعنی گلابی رنگ دیکھکر آپ کو کسی گلابی کپڑے کا یا بگل سن کر فوجی پریڈ کا خیال آئے گا اور آپ محظوظ ہوں گے - اگر تلازمہ کو علیحدہ کردیا جائے تو بعض محققین نفسیات کا خیال ہے کہ رنگ اور آواز کا تنہا اثر بھی پڑتا ہے -

اسی طرح کسی شے کے صوري پہلو کا اثر بھی ہمارے اوپر ہوتا ہے - صورت نام ہے ترتیب کا ' نقشہ کا ' نظام اور ساخت کا - اگر ہم کسی چیز کے صرف صوری پہلو پر نظر ڈالنا چاہیں تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے حسی پہلو کو الگ کردینا ہوگا - کسی تصویر کے صوری صفات اس وقت بہتر طریقہ پر ذہن نشین ہوسکتے ہیں جب رنگ کا خیال علحدہ کردیا جائے - اس وقت صرف خطوط اور ترتیب میں بھی کچھ، نہ کچھ قدر معلوم ہوگی - مثلاً سیدھی لکیر سے استقامت اور بڑی لکیر سے توازن کا اندازہ پایا جاتا ہے بعض تیڑھی اور ترچھی لکیریں روانی اور بہاؤ کی طرف اشارہ کرتی ہیں - حسی پہلو کی طرح صوری پہلو میں بھی تلازمہ کو کافی دخل ہے یعنی ایک چیز کو دیکھکر کسی دوسری چیز کی یاد آنا جس سے پہلے احساس کو کوئی تعلق رہا ہو - لیکن اونچے درجہ کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب کسی چیز کے حسی اور صوری پہلوؤں کا بہ یک وقت اثر ہو - معمولی صدا کو لیجئے - اس میں اثر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کو جب خاص نظام کے ماتحت راگ میں ڈھال دیتے ہیں تو اس کا اثر کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے -

یہ تو اشیاء کا براہ راست یا بلا واسطہ اثر ہوا - اب ذرا بالواسطہ اثر کو بھی لیجئے - بالواسطہ اثر میں حافظہ کو زیادہ دخل ہے - یعنی آپ نے کسی چیز کو دیکھا اور اس کا اثر دماغ میں محفوظ ہوگیا - اب آپ جب کوئی دوسری جیز ایسی دیکھیں گے جس کا اثر اس پہلی چیز کے اثر سے مل جائے گا تو آپ خود اپنی طبیعت کے لحاظ سے قدر پیدا کریں گے - اس طرح قدور پیدا کرنے میں ہر قسم کے شخصی و اجتماعی تجربات کو دخل ہوتا ہے - آپ کا شخصي تجربہ ہے کہ آگ کے شعلوں میں سرخی اور گرمی پائی جاتی ہے - آپ جب کوئی چیز سرخ

اور گرم دیکھیں گے تو آپ کا خیال آگ کی طرف جائے گا - پھر
اسی طرح سبزہ دیکھنے کے بعد بہار و گلشن کا یا کسی کی سبز
قبا کا خیال آئے گا - اور پھر آپ اپنے گذشتہ تجربہ کی بنا پر
مسرور ہوں گے - اجتماعی تجربہ کی مثال وہ تجربہ ہے جس کو عام
طور پر لوگ محسوس کرتے ہیں یا کرچکے ہیں الفاظ میں چونکہ
یہ صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے کہ وہ گذشتہ تجربوں کو زندہ
کرتا ہے اس لئے الفاظ کے ذریعہ اگر کسی تجربہ کا ذکر کیا گیا تو
وہ چیز فوراً ہر شخص کے سامنے آجائیگی - مثلاً اگر شعر میں گرمی
کی شدت ' لوؤں کی لپٹ ' باد صرصر کے طوفانوں کا ذکر ہے تو لوگ
گرمی کی لفظی تصویر دیکھ کر فوراً سمجھ جائیں گے اور اس سے
لطف اٹھائیں گے کیونکہ یہ ان کا ایک تجربہ ہے خواہ تلخ ہی کیوں
نہ ہو واضح رہے کہ ان چیزوں سے قدر اسی وقت پیدا ہوگی جب
خارجی شے میں جسے آپ دیکھ رہے ہیں یہ صلاحیت ہو کہ وہ
آپ کے دماغ کے کسی محفوظ شدہ علم میں جاکر مل جائے -
اگر آپ نے گرمی کی تکلیف نہیں اٹھائی ہے تو آپ کو گرمی کا
حال پڑھ کر لطف نہیں آئے گا - یعنی خارجی اور باطنی اثر میں
ایک طرح کی موزونیت اور ہم آہنگی ہونی چاہئے - اگر یہ صورت
ممکن نہیں ہے تو قدر غائب ہو جائے گی اور ساتھ ساتھ حسن بھی -
خارجی اشیاء کی یہ موزونیت خود ہماری پیدا کی ہوئی ہے - ہم
خوش ہیں تو سبز رنگ سے فرحت ہوگی کیونکہ سبز رنگ ہماری
اندرونی خوشیوں کا مظہر ہے - اسی طرح سیاہ رنگ سے اس لئے تکلیف
ہوتی کہ رات کی تاریکی ہمارے درد و غم کا مظہر ہے - ہم نے اپنے درد و غم
کو ' سیاہی ' کی شکل میں ایک خارجیت عطا کی ہے اگر ہمارا دل

پریشان و متفکر ہے تو تنہا و تاریک گوشہ میں اس کو سکون ملے گا اس لئے نہیں کہ تاریکی کو اس نے اپنا ہمدم بنا لیا ہے بلکہ خود تاریکی ہمارے اندرونی جذبات کی ترجمان بن گئی ہے اور اس لئے اس کی ہمدمی میں ہم کو لطف ملتا ہے -

تلازمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس چیز کو دیکھ کر کسی دوسری چیز کا خیال آئے اور جذبات ابھریں اس چیز میں موزوں طور پر اس دوسری چیز کی طرف اشارہ کرنے اور جذبات کو ابھارنے کی صلاحیت پائی جائے - اقبال کی دو نظموں کو لیجئے - اول صقلیہ - دوم گورستان شاہی - صقلی کا جزیرہ دیکھ کر خیال عرب کی پرانی حکومت ' مسلمانوں کے عروج ان کے بحری کارناموں اور تہذیب کی ترقی میں ان کی کوششوں کی طرف جاتا ہے - اور اس تمام احساس کو زندہ کرتا ہے جو تاریخ سے ہم تک پہونچا ہے - ظاہر ہے کہ صقلیہ میں عربوں کی پرانی تہذیب کی طرف موزوں طور پر اشارہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ یہ جزیرہ عربوں کی ترقی کا مرکز رہ چکا ہے - اس نظم سے ایک قدیم ماحول قائم ہوگیا حالانکہ خود صقلیہ میں آج ایسی کوئی چیز نہیں - یہ قدر جو اس میں موجود ہے خود ہماری داخل کی ہوئی ہے - اب اگر کوئی مصور اس کی تصویر بنائے تو صقلیہ کے سمندر میں عربی وضع کی کشتیاں دکھائے گا - ساحل کے مکانات بالکل عربی وضع کے ہوں گے اور سڑک پر چلنے والے بھی عربی جبہ زیب تن کئے ہوں گے - در اصل یہ صقلیہ آج کل کا صقلیہ نہ ہوگا بلکہ ہزار سال قبل کا صقلیہ ہوگا جس میں تخیل نے قدر پیدا کرکے حسین بنا دیا ہے - یہی حال ' گورستان شاہی ' کا ہے - گورستان کا خیال کوئی خوبصورت خیال نہیں ہوتا - اس کی

آغوش میں موت کا بھیانک ہاتھ پھیلا ہوتا ہے جو ہر ذی روح کو دعوت مرگ دیتا ہے - لیکن جب ان ٹوٹے پھوٹے مزارات پر تخیل اپنا کام کرتا ہے تو ہماری نظر میں وہ اینٹ اور پتھر کا ڈھیر نہیں ہوتے بلکہ ایک " برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ " بن جاتے ہوں اور ان میں ہمیں صاحبان مزار کے وہ کارہائے نمایاں نظر آتے ہیں جس سے ایک زمانہ اِن کا مطیع تھا -

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبین گستر فلک

اس طرح تخیل ان اینٹوں اور پتھروں سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے اور اس کے خیال سے پھر تصور خوش ہوتا ہے کیونکہ موجودہ دور کی بیکسی و کس‌مپرسی کا علاج ماضی میں ملتا ہے - اس طرح ہماری آزادی و اقتدار کی خواہش کو اس ملبہ میں سکون ملتا ہے اور اس سکون کے بعد ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ اس ملبہ میں قدر پوشیدہ ہے - جہاں تک بالکل شخصی تجربہ کا ذکر ہوتا ہے یہ قدر ذاتی ہوتی ہے لیکن جب کوئی محسوس کرنے والا کسی خاص ذاتی اثر کو ایک عالمگیر اثر کے مانند لاتا ہے تو بڑا صاحب نظر یا صاحب فن کہا جاتا ہے - مثلاً اقبال کا داغ والا مرثیہ لیجئے شروع میں شاعر نے اپنے تاثرات لکھے ہیں لیکن آخر میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے یعنی :—

کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زبان
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں

ایک ھی قانون عالمگیر کے ھیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے ' گلچین کا دنیا سے سفر

یہاں پہلے داغ کا ذکر تھا لیکن اب تمام عالم اس میں سمٹ کر آگیا اور ایک بلندی پیدا ہو گئی - یہ بلندی قدر کی بلندی ھے اور یہی حسن کی جان ھے -

احساس جمال درحقیقت روح کے ابھرنے اور ترقی کرنے کا نام ھے - روح کی حرکت کو سکون صرف ایسی بلند چیز میں ملتا ھے جو مجموعی طور پر ایسے ایک واحد کل کی حیثیت رکھتی ھو جس کے متعدد اجزاء آپس میں ھم آھنگی کے ساتھ مل جائیں - یہ وحدت و بلندی اس وقت حاصل ھوتی ھے جب تخیل رنگ ' آواز اور صورت کو موزوں طریقہ پر باھم دیگر روح کی نا آسودہ تمناؤں اور دل کے صدھا شوق نارسیدہ کے ساتھ اس طرح ملا دیتا ھے کہ ان میں باھم فرق مشکل معلوم ھوتا ھے اور ھر جز و کل میں اور کل جزو میں نا قابل امتیاز طریقہ پر مل جاتا ھے - یہ نئی دنیا وھی تخئیلی ھیولا ھے جہاں ھماری روح کی خواھشیں پوری ھوتی ھیں - اس تخلیقی قوت کو جب نقش و نگار ' موسیقی ' بت تراشی یا شعر میں منتقل کرتے ھیں تو اسے فن یا آرٹ کہا جاتا ھے - معلوم ھوا کہ حسن ھم صرف اپنی روحانی تسکین و آسودگی اور اندرونی اضطراب و التہاب کو کم کرنے کے لئے پیدا کرتے ھیں اور پھر خارجی اشیاء کو اس سے متصف کرتے ھیں - یہی اضطراب تمنا و جوش شوق قدر کا ضامن اور حسن کی علت ھے - یعنی روح ھی حسن کا اصلی سبب ھے کیونکہ روح خارجی اشیاء کو جذب کرکے ان کو اپنی تمناؤں کے مطابق ایک نئی 'صورت' میں

منتقل کر دیتی ہے اور یہی 'صورت' جو خود ہمارا روحانی عکس ہے حسن کی صورت ہے -

مرزا نے کیا خوب کہا ہے :—

وہی ایک بات ہے جو یہاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(۲)

حسن اور آرٹ

اب تک ہمارا موضوع بحث صرف حسن تھا جو ایک داخلی کیفیت کا نام ہے - اس کیفیت کے ماتحت تخیل انسان کو شادمانی اور مسرت کی دنیا میں پہونچا دیتا ہے - یہ روحانی عالم جمالیات کا نصب العین ہے - اور یہیں اس کی حد بھی ختم ہو جاتی ہے - اس جمال سے روح خاموش طور پر مسرور ہوتی ہے مگر یہ خاموش نغمہ تاروں سے نکلنے کی خواہش کرتا ہے اور تخیل کی طرف سے برابر اظہار کا تقاضا ہوتا رہتا ہے - جب تک اس اندرونی کیفیت کا خاطر خواہ اظہار نہیں ہو جاتا اس وقت تک دل کو سکون نہیں ملتا جب اس تخئیلی ہیولا کا اظہار شاعری ' بت تراشی ' موسیقی وغیرہ میں ہوتا ہے تو اسے فن یا آرٹ کہتے ہیں - جس طرح اس تخئیلی ہیولا میں خارجی شے اور تخیل دونوں کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے اسی طرح فن میں بھی بہ یک وقت تخیل اور خارجی شے کا اظہار ہوتا ہے - یہ تخئیلی ہیولا چونکہ خود روح کی تخلیقی صفت کا مظہر ہے اس لئے اس کا اظہار جب فن میں ہوتا ہے تو فن بھی تخلیقی ہوتا ہے -

ہم نے ابھی کہا ہے کہ جذبات اظہار کا تقاضا کرتے ہیں - مثلاً اگر آپ سمندر کے کنارے شام کے وقت غروب آفتاب کا منظر دیکھیں جب سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں ہوا کے اشارے پر ساحل سے کھیل رہی ہوں

اور پاس کے درختوں پر چڑیاں بھی ہلکے ہلکے سروں میں گارھی ہوں تو آپ کے دل میں بھی ایک نامعلوم خواہش اظہار پیدا ہوگی - اگر آپ موسیقی سے دل چسپی لیتے ہیں تو کچھ گنگنانے لگ جائیں گے - اگر شاعر ہیں تو کچھ نہ کچھ کہنے لگ جائیں گے اور جب تک کہ آپ اس دل فریب منظر کو اپنی بساط کے مطابق اپنے رنگ میں رنگ نہ دیں اس وقت تک آپ کو چین نہ آئیگا - اس وقت آپ اپنی تخلیقی قوت کے زور سے جو ہر انسان کو فطرت کی طرف سے کم و بیش عطا ہوتی ہے ایک حسین ہیولا تیار کریں گے - اگر آپ میں صلاحیت زیادہ ہے تو یہ ہیولا بلند مضامین سے پر ہوگا اور اس کے مختلف اجزا ہم آہنگی کے ساتھ مل کر ایک واحد کل کی شکل اختیار کر لیں گے اور اس ہیولا کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوگی جو آپ کے جذبات کے زیر و بم کو ظاہر کریگی - اس تخئیلی ہیولا کا اظہار جب صورت کے ذریعہ ہوگا تو اس کا نام فن یا آرٹ ہوگا -

مگر جذبات اظہار کا کیوں تقاضا کرتے ہیں اور دل میں کیوں ہیجانی کیفیت برپا ہوتی ہے ؟ اس ہیجانی کیفیت کی کئی وجہیں بتائی جاتی ہیں - بعض لوگوں کے نزدیک اس کی وجہہ الہام ہے یعنی صاحب فن پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے ماتحت وہ گلکاریاں کرتا ہے - اس لحاظ سے فن نام ہے کسی مضمون یا کسی کیفیت کی وضاحت کا یا کسی داستان کی شرح کا - مثلاً شاعر اپنے قصۂ غم کی شرح کرتا ہے یا بہار کے اثر کو بہاریہ مضامین باندھکر ظاہر کرتا ہے یا اگر حب وطن سے سرشار ہے تو اہل وطن کو پیام دیتا ہے - اسی طرح استادان موسیقی کسی کیفیت سے متاثر ہوکر کوئی خاص راگ گاتے اور

۱ — الہام

بنجاتے ہیں اور مصور مناظر فطرت کی نیرنگیوں کو آب و رنگ دیکر خطوط کی دنیا میں واضع کرتا ہے -

مگر الہام کے معنی ہیں در دل افگندن کے جس سے شاید مراد یہ ہے کہ صاحب فن پر کسی بالاتر ہستی کا باطنی طور پر اثر ہوتا ہے اور صاحب فن ویسے ہی نقش و نگار بناتا ہے جیسا اس ہستی کا ایماء ہوتا ہے - اکثر شعرا کو اسی لئے تلامذالرحمان بھی کہا گیا ہے کیونکہ بعضوں کا خیال ہے کہ خدا اور شاعر کے درمیان ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور خدا براہ راست شاعر کے دل میں جو بات ڈالتا ہے وہی شاعر شعر کی صورت میں ادا کرتا ہے - بہت سے بڑے بڑے شعرا اور صاحبان فن نے اس باطنی اثر کو محسوس کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے - مثلاً

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

دوش بر سوز دل و سینہ براتم دادند
سر چو شمع ببریدند و حیاتم دادند

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

درون سینۂ ما سوز آرزو ز کجاست ؟
سبو ز ماست ولے بادہ در سبو ز کجاست ؟

نگاہ ما بگر یبان کہکشاں افگند
جنون ما ز کجا شورہائے و ہو ز کجاست۔؟
جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم
این چیست کہ چون شبنم بر سینۂ من ریزی ؟

ہم کو اس کا عام طور پر قطعی علم نہیں کہ وہ باطنی اثر کبوں طاری ہوتا ہے اور کب طاری ہوتا ہے - یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے مگر اس کے باوجود جن پر طاری ہوتا ہے وہ اس کی حقیقت سمجھتے ہیں اور اس وقت ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا میں محسوسات سے بلند ہے -

لیکن الہام ایک اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے - مثلاً آپ کسی اچھے شاعر کا کوئی اچھا شعر سنتے ہیں تو اکثر بول اُٹھتے ہیں کہ صاحب یہ شعر نہیں الہام ہے یعنی فلاں مضمون کو اس بلند طریقہ سے ادا کیا گیا ہے جو بہت مشکل تھا اور شاعر اپنے تیز احساس کی بدولت اس بلندی پر پہونچ گیا جہاں آپ کا خیال نہ جا سکا تھا اور جب آپ اس شعر کی مدد سے وہاں پہونچے تو بے اختیار آپ کی زبان سے تحسین و آفرین کے کلمات نکل آئے - لیکن شاعر شعر کہنے کے قبل کسی چیز سے ضرور متاثر ہوا ہوگا یعنی جو مضمون اس نے باندھا ہے اس کا کچھ حصہ اس نے مشاہدہ کیا ہوگا اور یہی مشاہدہ اس ہیجان کی وجہ ہوگا جس میں بعد کو تخیل نے اور قدور شامل کر دئے ہوں گے -

حالی نے مسدس اور اقبال نے شکوہ لکھا اور دونوں مسلمانوں کی پستی سے متاثر ہوئے - دونوں نے اپنے اس تاثر کا اظہار اپنی اپنی نظموں میں کیا ہے - شکوہ اور مسدس بے شک دونوں بہت بلند نظمیں ہیں مگر کیا ان کا سرا الہام سے ملتا ہے ؟ سچ پوچھئے تو شاعر ہر چیز سے متاثر ہوسکتا ہے - اس کی گذشتہ زندگی ہر وقت اس پر اثر ڈالنے کے

لئے تیار رہتی ہے - پھر دنیا کی ساری تاریخ اس کے دماغ کے خزانہ میں
بند رہتی اور وہ بقدر ضرورت اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور کسی
واقعہ کے ذرا سے اشارہ پر اس تاریخ کا خزانہ کھل جانے کو تیار رہتا ہے -
شاعر تو بقول مرزا غالب باجے کی طرح شکووں سے پر ہوتا ہے - اس کو تو
بس چھیڑنے کی ضرورت ہے - اب خواہ یہ چھیڑ اس کو کسی واقعہ سے
ہو یا کسی منظر سے - اس کے لئے تو اشیاء میں ایک نشتر کا اثر
پنہاں ہوتا ہے جو دل کی رگوں سے برابر خون کا تقاضا کرتا ہے
اور جب تک شاعر خون کے آنسو رو نہیں لیتا اس کو تسکین نہیں
ہوتی - جب ضرورت ہوتی ہے وہ یہ نشتر خود تلاش کر لیتا
ہے - حالی کو یہ نشتر مسلمانوں کی موجودہ پستی میں ملتا ہے
مگر اقبال کو یہی نشتر کہیں بلقان کی لڑائی میں ' کہیں صقلیہ کے
جزیرہ میں ' کہیں شام کی خاموشی میں اور کہیں لالہ صحرا کے داغ میں
ملتا ہے اور یہیں سے وہ ہیجان اٹھتا ہے جو شعر کی صورت میں ظاہر ہوتا
ہے - اس کو غلطی سے لوگ الہام کہتے ہیں حالانکہ یہ سارا آتش گیر
مادہ مدتوں سے شاعر کی روح کے خاموش گوشوں میں پرورش پا رہا تھا
جس کو حوادث کی ایک چنگاری نے نذر آتش کردیا - اسی طرح
شادی و غم ' بہار و خزاں ' زندگی و موت یا کسی اور واقعہ سے دل پر
چوٹ لگتی ہے تو اضطرابی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور دل پگھل جاتا ہے -
صاحب فن اس پگھلے ہوئے مادہ سے تخلیق کا کام لیتا ہے - اگر وہ شاعر ہے
تو شعر کہنے لگتا ہے - مصور ہے تو تصویر بناتا ہے اور موسیقی سے دلچسپی
رکھتا ہے تو راگ اور راگنیاں نکالتا ہے - کہا جاتا ہے کہ تخلیق اس وقت
عمل میں آتی ہے جب صاحب فن کے جذبات برانگیختہ ہوجاتے ہیں
مگر سچ پوچھئے تو جذبات کا نام غلط ہے - انہیں تو رجحانات
یا خواہشات کہنا چاہئے - صاحب فن کچھ تمنائیں رکھتا ہے کچھ

آرزؤں سے نامعلوم طریقہ پر اس کا دل گداز رهتا هے اور یہ آرزوئیں اور تمنائیں اس وقت پوری هوتی هیں جب ان کا اظہار مناسب ذرائع سے اس طرح هو کہ جب ان کا تصور کیا جائے تو دل کو تسکین هو - مثلاً ایک شاعر کو ایک حسین چہرہ یا ایک خوبصورت پھول دیکھنے کے بعد اس وقت قرار آئے گا جب وہ شعر میں اپنی اس کیفیت کا ذکر کر لے گا بعد ازاں اس شعر کے تصور میں اس کو مسرت حاصل هوگی - غالب کا ایک شعر اس کیفیت کا کتنا آئینہ دار هے -

بتاؤ اس مژہ کو دیکھکر کہ مجھکو قرار
یہ نیش هو رگ جان میں فرو تو کیوں کر هو

اسی طرح ایک مصور کو تصویر بنانے اور ایک موسیقی دان کو راگ نکالنے کے بعد سکون حاصل هوگا - شے ایک هی هے مگر اس نے لوگوں کو تین طرح پر متاثر کیا - اس کی وجہ یہی هوسکتی هے کہ ان تینوں صاحبان فن کی فطرت مختلف هے اور مختلف ذرائع اظہار چاهتی هے - صاحب فن اپنے تمام رجحانات ماں کے پیٹ سے لیکر آتا هے اور اپنی ساری زندگی ان رجحانات کی پرورش اور نشو و نما میں ختم کر دیتا هے - وہ اپنے رجحانات کو بدل نہیں سکتا - اگر زمانہ نے نامساعدت کی تو وہ چیز دب جائیگی مگر بدلے گی نہیں - اساڈورا ڈنکن (Isadora Duncan) جو امریکہ کی ایک نہایت مشہور رقاصہ گذری هے اپنے سوانح حیات میں لکھتی هے کہ " میری پیدائش سے قبل میری ماں سخت روحانی اور جسمانی اذیت میں مبتلا تھی - وہ جھینگے مچھلی میں برف ڈال کر کھاتی اور شراب میں برف ڈال کر پیتی تھی اگر لوگ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے کب سے رقص کرنا شروع کیا تو میں کہوں گی کہ ماں کے پیٹ

سے اور شاید یہ اس غذا کا اثر ہو جو میری ماں کھاتی تھی کیونکہ عشق و محبت کی دیوی افرودیتے (Aphrodite) کی بھی یہی غذا بتائی جاتی ہے - میری ماں اس زمانہ میں سخت تکلیف میں گرفتار تھی اور اکثر کہا کرتی تھی کہ جو بچہ پیدا ہوگا وہ یقیناً عام بچوں سے مختلف ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ جس دم سے میں پیدا ہوئی میں اپنے پانوں اور بازوؤں کو اسی طرح حرکت دینے لگی کہ میری ماں یہ دیکھ کر چیخ اٹھی اور کہنے لگی کہ دیکھو میں نہ کہتی تھی کہ یہ بچہ دیوانہ ہوگا - تھوڑے دنوں بعد میری یہ حالت ہوگئی کہ کوئی بھی گت ہو میں اس پر رقص کرتی - یہ دیکھ کر میرے گھر کے لوگ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے...... شروع ہی سے میں اپنی روح کے اشارہ پر رقص کرتی تھی - بچپن میں بالیدگی کے احساس سے رقص کرتی تھی - شباب کی منزل میں آئی تو ان نشتروں کی خلش سے متاثر ہوکر رقص کرتی تھی جن کا اثر دل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتا ہے - یہ زندگی کے وہ تاثرات تھے جو تمام تمناؤں کا نہایت بیدردی کے ساتھ خون کرتے ہیں - بعد ازاں اس ظالم و بیدرد زندگی کے ساتھ مجھکو 'رقص کشاکش' بھی کرنا پڑا جس کو بعض لوگ 'موت' سے تعبیر کرتے ہیں " - یعنی ان فطری جذبات کو جلا دینے اور [illegible] (perfection) تک لیجانے کے لئے اظہار کے موزوں [illegible] ملاقات پیدا کرنا بڑی اہم امر ہے!

اس سے اتنا تو واضح ہوگیا ہوگا کہ فن کی صلاحیت فطری ہے مگر فن کی دنیا میں جذبات کے لئے ذریعہ نہایت اہم ہے - روح کے اظہار کے لئے اگر مناسب ذریعہ دستیاب ہوگیا تو روح و ذریعہ آپس میں اس طرح متحد ہوجاتے ہیں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہوتی ہے - اس وقت ذریعہ میں روح کی خصوصیات اور روح میں ذریعہ کی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں - لیکن صاحب فن کے لئے ذریعہ تلاش کرنا آسان نہیں - اس کو پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس کی فطرت اس کو کس ذریعہ کی

طرف لیجاتی ہے - اگر شاعری سے لگاؤ ہے تو اس کو شعر کہنا چاہئے - اگر موسیقی یا مصوری سے فطری دلچسپی ہے تو اس کو اس شعبہ میں مہارت حاصل کرنی چاہئے اور اپنے رجحان کے مطابق محنت کرنی چاہئے تاکہ صاحب فن اور ذریعہ میں مکمل ہم‌آہنگی ہوجائے - صحیح ذریعہ اس لحاظ سے روح کو تقویت بخشتا ہے اور اس کی نشو و نما میں مدد کرتا ہے لیکن اگر ذریعہ کے انتخاب میں غلطی ہوئی اور شاعر نے مصوری شروع کردی تو خشت اول چون نہد معمار کج والا معاملہ ہوجائے گا شاعر کبھی رنگوں کی آمیزش اور سادگی کے پر پیچ مسئلہ کو نہ سمجھ سکیگا اور نہ یہ مرحلہ اس سے کبھی حل ہوگا - ذریعہ اصطلاح کا حکم رکھتا ہے اس لئے ایک اچھے شاعر کو زبان ' محاورہ اور عروض وغیرہ سے بالکل اسی طرح سے آگاہی ہونی چاہئے جس طرح ایک اچھے مصور کو مختلف رنگوں کی خاصیت اور ان کے تدریجی تغیر (shade) کا حال معلوم ہوتا ہے - میرا یہ مطلب نہیں کہ علم عروض اور صنائع بدائع سے مکمل طور پر واقف ہوئے بغیر کوئی شاعر نہیں ہوسکتا - ایسا اکثر ہوا ہے کہ بعض لوگ مصطلحات شاعری سے مکمل طور پر واقف نہ تھے مگر بہت بڑے شاعر ہوئے - مولانا روم کہتے ہیں :—

شعر می گویم بہ از قند و نبات * من ندانم فاعلاتن فاعلات

اسی طرح کتنے ایسے لوگ ہیں جو عروض و محاورہ وغیرہ پر کافی عبور رکھتے ہیں مگر شاعری کی نعمت سے محروم ہیں - ان مثالوں سے میری مراد یہ ہے کہ تخیل کے ساتھ فن شاعری سے آگاہی بھی ضروری ہے ورنہ شاعر بے تکا ہوجائے گا - خیال کیجئے کہ اگر حسن معنی کے ساتھ حسن الفاظ نہ ہو تو سامع پر شعر کتنا گراں گذریگا - ایک اچھا شاعر حسن

خیال کے لئے عمدہ الفاظ تلاش کرتا ھے اور دونوں کی باھمی ترکیب سے
ایک پیکرِ حسن تیار کرتا ھے - لیکن ایک معمولی شاعر صرف الفاظ اور
محاورہ کی بندش وغیرہ ھی کو اپنا منتہائے کمال سمجھتا ھے اور محاورات
کے مانجنے اور قلعی کرنے میں یہاں تک لگا رھتا ھے کہ شاھدِ خیال اس
کی آنکھوں سے روپوش ھوجاتا ھے - اس کا احساسِ جمال بس الفاظ
کی دنیا تک محدود ھوجاتا ھے - یا ایک مصور کی مثال لیجئے
جو مختلف رنگوں سے عروس خیال کو سنوارتا ھے اور زیبائش بخشتا
ھے مگر ایک دوسرا شخص ھے جو صرف رنگ بناتا ھے - رنگ بنانے والے کے
لئے خیال و معنی کی دنیا بہت دور ھے کیونکہ یہ تو مصور کا کام ھے جو
رنگ اور معنی میں اتصال پیدا کرتا ھے - رنگ بنانے والا کا درجہ تو محض
جزو کا ھے جس کو لوگ اکثر غلطی سے کل کا درجہ دیدیتے ھیں - شاعری میں
ان لفظی رعایتوں پر زور دینے والوں کی حیثیت اسی رنگ ساز کی ھے
جو رنگ تو بناتا ھے مگر رنگ کے معنی سے بے خبر ھے اور لوگ ناواقفیت
سے اس کو شاعر سمجھتے ھیں - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس
جزو میں اس رنگ ساز کی حیثیت ایک چھوٹے کل کی بھی ھے کیونکہ وہ
اپنے محدود دائرہ میں مختلف قسم کے رنگوں سے تجربہ کرتا ھے اور جو رنگ
بہتر دیکھتا ھے ان کو تیار کرتا ھے - مگر ایک مصور کے یہاں جیسا کہ میں
ابھی کہہ چکا ھوں اس چھوٹے کل کی حیثیت محض ایک جزو
کی ھوتی ھے - اس جزو اور کل میں کوئی خاص امتیازی نشان قائم
کرنا اس لحاظ سے ذرا مشکل معلوم ھوتا ھے کہ رنگ ساز کا جزو مصور
کے کل میں جاکر مل جاتا ھے - اگر امتیاز ھوسکتا ھے تو بس اسی صورت
سے کہ وہ جزو ھے - یہی حال رقص کا بھی ھے - یعنی ھاتھ اور پائوں
کی موزوں اور مناسب حرکت جہاں تک جذبات اور وجدانات کی ترجمانی

کرتی ہے وہ آرٹ ہے لیکن جب حرکت ہی کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی جاتی ہے تو رقص کی اصلی روح افسردہ ہوجاتی ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ جس طرح رنگ ساز کو رنگ بنانے اور معمولی شاعرکو الفاظ و محاورہ کے مانجنے میں مسرت ہوتی ہے اسی طرح بعض رقص کرنے والے کو صرف ہاتھ، پانوں کی حرکت ہی میں لطف ملتا ہو - اس لحاظ سے اس نے جزوی طور پر تو ضرور جمال پیدا کرلیا مگر اس میں وہ عظمت و بزرگی نہ ہوگی جو اس رقص کرنے والے کا حصہ ہے جسکو کل کا احساس ہے -

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بیشتر ایسا ہوا ہے کہ کتنے شعرا فنی اصطلاحات سے پورے طور پر واقف نہ تھے مگر اس کے باوجود بہت بڑے شاعر ہوئے - ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان ان کے شدت احساس کا ساتھ، نہیں دے سکی اور شاید اسی لئے آپ تقریباً تمام بڑے بڑے شعرا کے کلام میں زبان ' محاورہ اور عروض وغیرہ کا کہیں نہ کہیں سقم ضرور پائیں گے - مولانا روم کے شاعر اعظم ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے لیکن ان کے یہاں بھی اسقام ملتے ہیں - حافظ کے کلام سے مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے شعرا نے استفادہ کیا اور یہ کہنے میں مجھے بالکل باک نہیں کہ یہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے یہاں رفعت خیال کا ساتھ، الفاظ کی پرواز نے زیادہ سے زیادہ دیا ہے گو مکمل طور پر نہیں دیا مگر ان کے یہاں بھی باوجود لطافتوں کے کہیں کہیں خامیاں نظر آتی ہیں - مثلاً ایک مشہور غزل کا مطلع ہے -

صلاح کار کجا و من خراب کجا

ببین تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا

یہاں خراب کا قافیہ تابہ باندھا گیا ہے - اس قسم کی اور بھی باتیں بتائی جاسکتی ہیں - غالب و میر بھی اس سے بری نہیں - غالب کے یہاں تو اسقام کی تعداد کافی ہے - مثلاً

دل اس کو پہلے ھی ناز و ادا سے دے بیٹھے

ھمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ھوا

جوئے خون ھم نے بہائي بن ھر خار کے پاس

ان نامی شعرا کے اسقام کی طرف اشارہ کرنے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ان کے اسقام کي تشہیر کروں بلکہ میرا مقصد اس اظہار سے صرف یہ بتانا ہے کہ ان شعرا کا احساسِ جمال اتنا شدید تھا کہ ان کے زمانہ کی زبان ان کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ھوئی - تقریباً ھر بڑے شاعر کے سامنے یہ مرحلہ آتا ہے اور اسي لئے آپ نے دیکھا ھوگا کہ وہ صرف اپنی تسکین کے لئے زمانہ سے الگ ایک راستہ نکال کر خود اپنی زبان وضع کرتا ہے ' اپنی ترکیبیں بناتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنی ترجمانی کرسکے - ابنائے زمانہ ان ترکیبوں کو اکثر قبول کر لیتے ھیں اور اکثر غرابت کے باعث علیحدہ چھوڑ دیتے ھیں - لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ بڑے شعرا اپنے زمانہ کے محاورات کی چہار دیواری کے اندر رہ کر اپنے جذبات کو مکمل طور پر بیان کردیں - بے شک اگر وہ ایسا کرتے تو بہت اچھا ھوتا مگر یہ ناممکن ہے - شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ہے کہ بڑا شاعر جدت پسند ھوتا ہے اپنی روح کے لئے علیحدہ فضا تیار کرتا ہے وہ عوام سے ملا ھوا بھی اور عوام سے بلند بھی ھوتا ہے - اس لئے جب وہ اپنی بلندی پر پرواز کرتا ہے تو زبان جو

عوام کے مبتذل جول سے بلند ہے پیچھے رہ جاتی ہے اور اس بلندی پر جو کچھ وہ کہتا ہے اس سے اس کا مقصد محض اپنی روح کی ترجمانی کرنا ہوتا ہے - اس لحاظ سے وہ خامی خامی نہیں ہوتی بلکہ روح کا شوق آزادی ہے جو نئی نئی منازل کے تجربوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہر وہ شخص جس کے کلام میں سقم ہے بڑا شاعر ہے - بڑے شاعر کا سمجھنا تو صرف اہل ذوق اور اہل معنی کا کام ہے - لیکن یہاں یہ کہنے دیجئے کہ بڑا شاعر یا بڑا صاحب فن ذریعہ و اصطلاحات سے بالکل نابلد بھی نہیں ہوتا - اگر ذریعہ سے ناواقف ہے تو اس میں بے تکا پن آجائے گا - ہاں اگر ذریعہ سے واقف ہے اور ذریعہ میں ''خامی'' ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری تخلیق بے معنی ہوجائیگی -

دوسری چیز جس سے روح میں ہیجان پیدا ہوتا ہے وہ ایک جاوید زندگی کی خواہش ہے - یعنی صاحب فن کے دل میں یہ خواہش چھپی ہوتی ہے کہ وہ غیر فانی انسان ہوجائے اور اپنی اس خواہش کو پوری کرنے کے لئے وہ صورت گری کرتا ہے اور یہ صورت اسکی تمناؤں اور رجحانات کا عکس ہوتی ہے - صاحب فن سمجھتا ہے کہ یہ صورت وہ اپنے بعد چھوڑ جائیگا اور وہ دیرپا ہوگی اور اس کے بعد لوگ اس صورت کو دیکھکر اسکو یاد کریں گے - دراصل اس صورت کے پردہ میں خود صاحب فن کی زندگی جاوید کی خواہش تکمیل پاتی ہے -

۲ — تمنائے زندگی جاوید

خواجہ حافظ فرماتے ہیں :—

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مرزا غالب فرماتے ھیں :—

تاز دیوانم کہ سر مست سخن خواھد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواھد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواھد شدن

شیکسپیر نے بارھا اپنی نظموں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں مٹنے والی ھیں مگر اس کا کلام غیر فانی ھے -

مگر فن اسي وقت اس خواھش کا حامل سمجھا جائیگا جب صاحب فن کا احساس اتنا شدید ھو کہ صاحب فن مجبور ھوکر صورت گری مکمل طور پر کر لے - اگر شعر پورا نہ ھوا اور نقاشی یا مصوری ادھوري رہ گئی تو یہ خواھش پوري نہ سمجھی جائے گی کیونکہ جن خواھشات کو دیرپا بنانے کا خیال تھا ان کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب ان کي تشکیل مکمل طور پر ھوچکی ھو -

اس طرح صاحب فن میں ھیجان پیدا ھونے کا ایک تیسرا نظریہ بیان کیا جاتا ہے جس کو نقالی کہتے ھیں - یعنی صاحب فن جس چیز سے متاثر ھوتا ہے اس کی صرف نقل کرتا ہے یا اس کا چربہ اتارنا چاھتا ہے اور چربہ اتارنے کي یہ خواھش آرٹ میں ظاھر ھوتی ھے - لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو کسي چیز کا پورا پورا چربہ اتارنا نہ صرف مشکل ھے بلکہ محال ہے - کوئی شخص خواہ وہ کتنا ھی بڑا صاحب فن کیوں نہ ھو کسی چیز کی مکمل طور پر نقالی کر ھی نہیں سکتا - فرض کیجئے کہ آپ کو کسی شخص کی تصویر کھینچنا ہے تو آپ پہلے یہ دیکھیں گے کہ تصویر

۳—نقالی

کس رخ سے اچھی آسکتی ھے پھر جو رخ آپ کے سامنے ھوگا اسی کی تصویر آئیگی - اس لحاظ سے دوسرے رخ کی تصویر اچھی نہیں ہسکتی - پھر جو رخ آپ کے سامنے ھے اس میں بھی آپ کو دیکھنا پڑیگا کہ کون سا حصہ تصویر میں نمایاں ھونے کے اور کون سا بالکل چھوڑ دینے کے قابل ھے - یعنی آپ کو اپنے ذاتی وجدان سے کام لینا پڑیگا اور رخ کے انتخاب میں آپ وھی حصہ سامنے رکھیں گے جس سے آپ کے احساس جمال کو تسکین ھو - اس طرح یہ واضح ھوگیا ھوگا کہ کسی چیز کی مکمل طور پر نقالی ناممکن ھے - صاحب فن کو قدم قدم پر اپنی قوت انتخاب یا قوت قدریہ سے کام لینا پڑیگا اور جو تصویر وہ تیار کریگا وہ بالکل نقل نہ ھوگي گو کہیں کہیں تصویر میں اصل کے بعض پہلو ضرور نمایاں ھوں گے - اس لحاظ سے نقالي آرٹ کا کوئی حقیقی اصول نہیں ھے بلکہ عمل کا ایک حصہ ھے - لیکن جیسا میں نے ابھی بتایا ھے مصوري میں نقل کا کچھ، نہ کچھ، اثر ضرور ھوتا ھے کیونکہ اگر آپ تصویر کی عمدہ نقل اتارتے ھیں تو آپ کو ایک گونہ خوشی ھوتی ھے کہ آپ میں صحت کے ساتھ، کسی چیز کے اخذ کرنے اور ترتیب دینے کی صلاحیت موجود ھے - اکثر لوگوں کو نقل مطابق اصل اتارنے میں اس لئے بھی لطف آتا ھوگا کہ وہ چند سادہ دلوں یا سادہ لوحوں کو اپنی تفریح طبع کے لئے کچھ، دیر فریب نظر میں گرفتار کر رکھیں - مثلاً کسی دیوار میں اگر دروازہ اس طرح رنگ کر بنایا گیا ھو کہ معمولی دیکھنے والا یہ سمجھکر کہ دروازہ ھے اس کو کھولنے کی کوشش کرے تو آپ اس کی سادہ دلی پر ھنس پڑیں گے اور خوش ھوں گے کہ کیا فریب دیا مگر یہ خوشی اس روحانی مسرت سے بالکل علیحدہ ھے جو تخئیلی ھیولا کو رنگ اور الفاظ کا جامہ پہناتے وقت ھوتی ھے - اگر کوئی مصور کسي قدرتی منظر سے متاثر

ہوا ہے اور اس نے اس منظر کی کوئی تصویر بنائی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس تصویر میں اس نے اپنی قوت انتخاب سے کام لیکر تخیل کو بہت کچھ اس میں داخل کردیا ہے اور آپ اس تصویر کو دیکھ کر اس منظر کا خیال ضرور کریں گے کیونکہ وہ منظر اس تصویر میں ایک حد تک موجود بھی ہے اس لحاظ سے نقالی کا کچھ نہ کچھ اثر آرٹ پر ہوتا ہے مگر یہ آرٹ کا کوئی مرکزی اصول نہیں ہے -

۴ — اظہار جذبات

چوتھا نظریہ جس کو اکثر اصحاب ضروری خیال کرتے ہیں اور جس سے دل پگھلتا ہے وہ صاحب فن کا اپنا درد دل دوسروں پر ظاہر کرنے کا جذبہ ہے - یعنی جو شعلہ صاحب فن کے دل میں بھڑک رہا ہے اگر وہ کسی طرح دوسروں کے دل میں بھی بھڑک اُٹھے تو یقیناً لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوجائیگی اور پھر بمصداق "مرگ انبوہ جشنے دارد" اس کے دل میں بھی وہ اگلی سی بیقراری اور تکلیف نہ رہیگی - بعضوں نے کہا ہے کہ آرٹ صرف جذبات کا اظہار ہے - کسی کا ان سے مطلع ہونا ضروری نہیں - لیکن اگر کوئی مطلع ہوگیا ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں - اس کی مخالفت میں پروفیسر ابر کرامبی کا قول ہے کہ صاحب فن کے جذبات سے دوسروں کے آگاہ ہونے کا نام ہی آرٹ ہے اور جب ہم کسی آرٹ کے نمونہ کو دیکھتے ہیں تو ہم تک صاحب فن کا احساس منتقل ہوتا ہے - اگر ہم صاحب فن کے احساس میں اس آرٹ کے ذریعہ شریک نہ ہوں تو صاحب فن کا مقصد پورا نہ ہوگا - ہم صاحب فن کے احساس کو اُس کے آرٹ کے ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کی خواہش کو جو تماشائیوں کی طالب ہے پورا کرتے ہیں - ہمارے تماشائی بننے سے صاحب فن کا کمال اور ترقی کرتا ہے - " اگر احساس جمال آرٹ کی تحریک کا باعث ہے تو اس

تحریک کا مغز وہ اظہار ہے جو صاحب فن دوسروں کی آگاہی کے لئے کرتا ہے " - مان لیجئے کہ ایک شخص غروب آفتاب یا شب ماہ کا لطف اُٹھاتا ہے تو وہ کوئی آرٹ نہیں تیار کرتا - ہاں جب وہ اس لطف کو دوسروں پر ظاہر کرکے ان کو شرکت کی دعوت دیتا ہے تو وہ گویا آرٹ تیار کرتا ہے - اس لحاظ سے آرٹ کسی انفرادی جذبہ کا نام نہیں بلکہ وہ ذریعہ ہے جس سے دوسروں کو صاحب فن کے احساسات کے سمجھنے کی دعوت دیجاتی ہے - جب تک صاحب فن دوسروں کو اپنے جذبات سے آگاہ نہیں کرلیتا اس وقت تک وہ صاحب فن نہیں ہوتا - جس طرح لوگوں کو خوشی و انبساط کے لمحوں کو طول دینے کے لئے آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح آرٹ کو بھی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ لوگ اسکو دیکھیں - اگر آپ صاحب فن کے سامنے سے تماشائیوں کو یا آرٹ سے لطف اٹھانے والوں کو ہٹا لیں تو آپ گویا صاحب فن کے اصلی مقصد میں خلل انداز ہو رہے ہیں کیونکہ آپ اس کے سامنے سے اس چیز کو ہٹا رہے ہیں جو آرٹ کی تحریک کا باعث ہے -

آرٹ کا تقاضا ہے کہ صاحب فن کے احساس کا اظہار دوسروں پر ہو - دوسروں پر اظہار سے کیا مطلب ہے اور یہ اظہار ہو تو کیونکر ہو کیونکہ کسی شخص کے احساسات و جذبات سے پوری پوری آگاہی حاصل کرنا ناممکن ہے - یہ ایک کیفیت ہے جس کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس پر یہ طاری ہوتی ہے - دوسرے کو کیا معلوم کہ فلاں کے دل میں کیا ہے - یا فلاں پر کیا گذر رہی ہے - اس کیفیت کو نظیری یوں ادا کرتا ہے -

بذیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی، اندرونی کیفیت کسی حد تک بذریعہ تمثیل و ہمدردی سمجھ سکتا ہے یعنی اگر کسی کو چوٹ لگی ہو تو دوسرا شخص وہ درد تو محسوس نہیں کرسکتا مگر یہ سوچے گا کہ جب خود اس کو چوٹ لگی تھی تو کیا ہوا تھا اور اپنی اسی تکلیف کا خیال کرکے اس کے ساتھ ہمدردی کریگا اور اسی معنی میں ایک شخص دوسرے کی اندرونی کیفیت سمجھ سکتا ہے - صاحب فن جب آرٹ تیار کرتا ہے تو ہمکو موقع دیتا ہے کہ ہم اس کو دیکھکر اپنے اندر بھی ویساہی احساس پیدا کریں جیسا صاحب فن کے دل میں پیدا ہوا تھا - اس طرح وہ اپنی کیفیت دوسروں پر ظاہر کرتا ہے - اگر اس کا اظہار شعر میں یا تصویر میں ہوا ہے تو ہم وہ شعر سن کر یا تصویر دیکھکر اپنے دل کے اندر ویساہی احساس پیدا کرسکتے ہیں جیسا شاعر یا مصور کے دل میں پیدا ہوا تھا - صاحب فن اپنا پورا احساس آرٹ میں منتقل کرتا ہے اور ہم آرٹ دیکھکر وہ احساس پیدا کرسکتے ہیں -

مندرجہ بالا بیان پروفیسر ابرکرامبی کے قول کا خلاصہ ہے - مگر ایک سوال ہوتا ہے کہ کیا صاحب فن کے لئے دوسروں پر اظہار کا جذبہ اشد ضروری ہے - کیا اسکے بغیر ایک صاحب فن صاحب فن نہیں ہوسکتا ؟ یہ ہملے مانا کہ صاحبان فن دیگر انسانوں کی طرح مدنیت کے طالب اور اجتماعی زندگی کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اپنی روزمرہ زندگی میں بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہوتے ہیں مگر ان کی طبیعتیں بڑی نازک ہوتی ہیں - ان کو آرٹ کی تخلیق کے وقت شاید ہی اس کا خیال ہوتا ہو کہ زمانہ ان کے فن کو کس نظر سے دیکھیگا - وہ جس وقت شعر کہتے یا مصوری کرتے ہیں تو ان کو خیال صرف اپنا ہوتا ہے - یعنی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ

انھوں نے اپنے جذبات کی کس حد تک کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی ھے - وہ تو اپنی روح کے لئے ایک فضا تیار کرتے ھیں اور اسی میں پرواز کرتے ھیں - ان کو اس سے کیا مطلب کہ لوگ ان کے آرٹ کی تعریف میں رطب اللسان ھیں یا اس سے نفرت کا اظہار کرتے ھیں - مرزا نے کہا ھے :—

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ھیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اکثر دیکھا گیا ھے کہ بعض شعرا نے اپنا دیوان نذر آتش کردیا - گوئٹے نے جب فاؤست کی دوسری جلد مکمل کرلی تو اسے سربمہر کر کے صندوق میں بند کر دیا اور ھدایت کردی کہ اس کے مرنے کے قبل اس کو شائع نہ کیا جائے - کہا جاتا ھے کہ غالب نے اپنا ایک دیوان جمنا میں بہا دیا - اگر دوسروں پر اظہار کی خواھش ھوتی تو مندرجہ بالا واقعات کیوں رونما ھوتے - اصولاً یہ بالکل ممکن ھے کہ ایک شخص جنگل میں انسانوں کی مجلس سے دور آرٹ کا عمدہ نمونہ تیار کرے اور جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ھے یہ نمونہ بالکل مکمل ھوگا لیکن اس میں صورت و معنی کی بہت سی خامیاں ھوں گی جو محض ایک اجتماعی نظام کے ماتحت دور ھوسکتی ھیں کیونکہ اجتماعی نظام کے ماتحت صاحب فن صورت و معنی کی بہت سی باریکیاں سمجھنے لگتا ھے اور پھر ان کو اپنے تخیل کی آمیزش کے بعد آرٹ میں منتقل کرتا ھے - مگر یہ بھی صحیح ھے کہ اگر صاحب فن ایک طرف دنیا والوں سے بےنیاز ھوکر کلبۂ عزلت میں اپنی مسرت کے لئے پیکر تراشی کرتا ھے تو دوسری طرف اس کے دل میں یہ خواھش بھی ھوتی ھے کہ کوئی نہ کوئی اس کی ھستی کو سمجھے مگر یہ خواھش اس کے فن کا کوئی مرکزی ستون نہیں جس سے آرٹ رونما ھوتا ھے بلکہ یہ ایک جزوی خواھش

ھے جو صاحبان فن میں اکثر پائی گئی ھے - ھاں البتہ تھیٹر میں سوانگ بھرنے کا جو فن ھے اس کے لئے یہ از بس ضروري ھے کہ لوگ اسے دیکھیں کیونکہ اس کا مقصد بغیر مجمع کے پورا ھو ھی نہیں سکتا -

جس طرح ایک زمانہ میں مشرق میں کوکا پنڈت کا زور تھا

۵—رغبت جنسي

اسي طرح آج کل مغرب میں کوکا پنڈتوں کا زور ھے مگر مغرب کے کوکا پنڈت کچھ مختلف ھیں - سائنس کی عینک چڑھائے اور تحقیقات کا قلم ھاتھ میں لئے جو چاھتے ھیں لکھ جاتے ھیں - اس گروہ کے سر تاج ویانا کے مشہور ڈاکٹر سگمنڈ فریوڈ ھیں - ان کا قول ھے کہ انسان خواھشات کا بندہ ھے اور جو چیز اس کی خواھشات پر حکمرانی کرتی ھے وہ رغبت جنسی ھے - شاعری ' مصوری ' موسیقی ' فلسفہ ' ادب غرض زندگی کے ھر شعبہ میں اسی کا ظہور ھے - اگر یہ نہ ھو تو شمع زندگی بالکل مردہ ھوجائے - ان کے بعض پیرووں نے ان سے شدید اختلاف کیا ھے مگر ڈاکٹر فریوڈ کی روح آج تمام مغربی دنیا میں سرایت کئے ھوئے ھے -

اس مذھب کے مطابق آرٹ کا محرک شہوانی جذبہ ھے - مثلاً شاعری میں عشق و محبت ' ھجر و وصل کے خیالات کا اظہار ھوتا ھے کبھی ھجر کی شکایت ھے تو کبھي وصل کی خوشي - کبھي لب و دنداں کا ذکر ھے تو کبھی رخسار و چشم کی تعریف - غرض شاعر کبھی معشوق کا سراپا بیان کرکے کبھی ' معاملہ بندی ' کے بہانہ سے اپنے شہوانی جذبہ کو تسکین دیتا ھے - مصور بھي اسی طرح معشوق کی تصویر مختلف طریقوں سے بناتا ھے - مغنّی اسی کو نغمہ میں اور رقاص اپنے رقص میں ادا کرتا ھے - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو رغبت جنسی ایک فطری یا جبلی خواھش ھے - جس طرح بھوک لگتی ھے ' پیاس کا غلبہ ھوتا

ہے اور نیند کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسی طرح نظام جسمانی کو عضویاتی سکون کی ضرورت ہوتی ہے - ہم بتا چکے ہیں کہ جمال درحقیقت روح کا فیض ہے اور جب اس جمال کو رنگ ، لفظ یا آواز کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں تو وہ آرٹ ہوتا ہے - رغبت جنسی میں روحانی جزو کم ہوتا ہے - کم میں نے اس لئے کہا کہ جسم کو کسی طرح روح سے الگ نہیں کرسکتے - ہر وہ چیز جس کا جسم سے تعلق ہے اس میں روح کا کچھ نہ کچھ ضرور اثر پایا جاتا ہے - اس لحاظ سے ممکن ہے کہ آرٹ کی تخلیق میں ابتدائی طور پر رغبت جنسی کا کچھ اثر ہو لیکن جب آرٹ اپنے کمال کی طرف بڑھتا ہے اور بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے تو اس وقت رغبت جنسی سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں رہ جاتا - اس مقام پر نہ ہجر و وصال کی وہ اگلی سی کیفیتیں باقی رہتی ہیں اور نہ معشوق کے سراپا کا خیال ہوتا ہے - یہاں تو صاحب فن آپ اپنا تماشا دیکھتا ہے - عارف شیراز نے کہا ہے -

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد
کہ نام آں نہ لبِ لعل و خط زنگاریست

بعضوں کا خیال ہے کہ آرٹ کا محرک ہمارا غیر شعوری جذبہ ہے - اس کے متعلق ہمارا علم ابھی بہت کم ہے لیکن اس میدان میں تحقیقات کا قدم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے - جو چیز آج غیر شعوری نظر آ رہی ہے ممکن ہے کل اس حد تک وہ غیر شعوری نہ رہے - اس لئے اس پر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ جذبہ ، ناآسودہ خواہشات اور نا رسا مطالبات کا ایک سمندر بے پایاں ہے جو برابر موجیں مارتا رہتا ہے - اس میں عقلیت کا جزو بالکل نہیں ہوتا - اس کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے

۶—غیر شعوری جذبہ

تو نظام معاشرت درهم برهم هوجائے - اس کی تند اور تیز موجوں کو روکنے کے لئے شعور نے بند باندھ رکھے هیں - ماهرین نفسیات کا بیان هے کہ شعور کا عمل غیر شعوری جذبہ پر تین طرح سے هوتا هے -

(الف) شعور انسان کی سفلی خواهشات پر جو معاشرہ کے خلاف هیں زبردست لگام لگاتا هے اور ایسی کوئی چیز پیش آنے نہیں دیتا جس سے نظام معاشرت میں کسی خرابی کا امکان معلوم هوتا هو -

(ب) دوسرا طریقہ یہ هے کہ اس جذبہ کو ایک ایسے راستہ پر لگا دیا جائے جس سے اس کی خرابیاں دور هوجائیں مثلاً غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ جو اکثر ملکوں میں کار فرما هے اس کا رخ بدل دیتے هیں اور اس کو ملک کی ترقی و اصلاح کی طرف لگاتے هیں -

(س) تیسرا طریقہ یہ هے کہ سفلی کو بلند کر کے علوی کے درجہ پر پہونچا دیا جائے -

مگر اس کے باوجود اس کا اثر نمایاں هوتا هے کیونکہ اس میں طوفان کا سا جوش اور بجلی کا سا اضطراب هوتا هے - یہ گویا زندگی کا پوشیدہ خزانہ هے - یقین یہیں پختہ هوتا هے - عمل کی بنیاد اسی جگہ استوار هوتی هے - جذبات یہیں سے ابھرتے هیں - غرض یہ هماری سیرت کا منبع هے - لیکن ایک عجیب بات یہ هے کہ باوجود سفلی آمیزش کے اس کی گہرائی میں حقیقت کی تلاش و جستجو کی خواهش بھی چھپی هوتی هے جو کائنات کی راز دار بننا چاهتی هے - جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر گوئٹے اپنے مشہور ناول ' نوجوان ورتھر کی داستان غم ' میں لکھتا هے -

'' جب میں ان مناظر قدرت کو دیکھتا هوں تو میرے قلب میں ایک جوش کی کیفیت اور ایک نور کی چمک پیدا هوتی هے جس سے اس

کائنات کا ذرہ ذرہ منور ہے - ان جذبات کی روانی سے میں اپنے کو ایک ایسی بلند سطح پر پاتا ہوں جہاں سے خدا کی شان کبریائی اور اس ناپیدا کنار عالم کی خوشنمائی اور بوقلمونی کا تماشا میری روحانی آنکھوں کو صاف نظر آتا ہے۔ اُس وقت بڑے بڑے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں میرے گرد احاطہ کرتی ہیں ' بڑے بڑے غار میرے قدموں کے لئے راستہ بناتے اور پرشور آبشار میرے سامنے سر کے بل غلطاں اور پیچاں نظر آتے ہیں - موجیں مارنے والے بڑے بڑے دریا میدانوں میں بہتے ہیں اور ان کے شور سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں اور سطح زمین پر آسمان کے نیچے جانداروں کی لاکھوں کروڑوں قسمیں حرکت کرتی ہیں ' گویا میرے چاروں طرف ہر چیز بے شمار صورتوں کے ساتھ زندہ نظر آتی ہے - مگر افسوس آدمی کتنا بیوقوف ہے کہ اپنی حفاظت کے خیال سے اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں گھس کر بیٹھتا ہے اور اپنی اس پناہ سے بزعم خود اس عالم بسیط پر حکومت کرتا ہے - اف ! اس کے تنگ خیال میں ہر چیز کتنی تنگ نظر آتی ہے - لیکن ناقابل گذر پہاڑوں سے لق و دق صحراون سے جو اب تک انسانی قدم کے نقوش سے بالکل پاک ہیں اور سمندروں کے نا معلوم کناروں سے اس خداے لایزال کي تسبیح و تہلیل ہر وقت بلند ہوتی رہتی ہے...... چڑیوں کی پرواز دیکھ کر کتنی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئي ہے کہ کاش میں اس بحر بیکراں کے کنارے اڑ کر پہونچ جاتا اور اس بارگاہ بے پایاں سے مجھے بھي نشاط زندگي کا ایک چھلکتا ہوا جام عطا ہوتا اور میری روح کی قوتیں گو محدود سہي مگر تھوڑی دیر ھی کے لئے اس خالق بے نیاز میں جاکر گم ہو جاتیں جو اپني ذات سے ہر چیز کا مکمل کرنے والا ھے " -

یہ روح کا تقاضا ہے کہ انسان ایک ایسي مافوق الفطرت هستی کي جستجو کرے جو اس کائنات کي ناظم ہے - یہ انسانی وجد ان کي طلب

وسعی کا ماحصل ہے کہ وہ اس عالم سے نقاب الٹ کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کرے - جس وقت یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اس وقت روح کو اپنی لامحدود وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور خود اس کی انفرادی ہستی اس اصل حقیقت میں جاکر گم ہوجاتی ہے - حالانکہ یہ روحانی تجربہ ایک واقعہ ہوتا ہے مگر اسکا خاطر خواہ اظہار ناممکن ہے - اکثر صاحبان حال نے بیاں کیا ہے کہ اس وجدانی کیفیت کا ایک لمحہ زندگی بھر کی محنتوں اور مشقتوں سے بہتر ہے - انسان اس وقت سب کچھ دیکھتا ہے مگر دکھا نہیں سکتا - خود سمجھتا ہے لیکن اوروں کو سمجھا نہیں سکتا - منطق کا کوئی اصول فلسفہ کا کوئی نکتہ اس راز کو حل نہیں کرسکتا اس لئے کہ حقیقت ایک بے صورت چیز ہے جو الفاظ اور رنگ میں اسیر نہیں کی جاسکتی سعدی کہتے ہیں کہ - آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد - یعنی اس منزل کا جس کو پتہ چلا پھر دنیا والوں کو اس شخص کا پتہ نہیں چلتا - اس کیفیت کا مکمل اظہار کسی طرح بھی آرٹ میں ممکن نہیں - تمام ذرائع ناکام رہ جاتے ہیں کیونکہ اس نغمۂ سرمدی کو ' نازک سے نازک تار بھی برداشت نہیں کر سکتے - غالب نے کیا خوب کہا ہے :—

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یعنی جب انسان پر اس حقیقت کبریٰ کا جلوہ پڑتا ہے تو اس وجدانی کیفیت کا اظہار ناممکن ہوتا ہے - گویا اصل حقیقت اسی وقت منکشف ہوتی ہے جب تار ہستی شکست ہو جاتا ہے - مرزا نے اسی کو ایک جگہ فارسی میں بھی ادا کیا ہے :—

دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجوئے

آوازے از شکستن تار خود یم ما

زبان بندي کے اس دستور کے باوجود انسان سے بالکل خاموش بھي نہیں رھا جاتا - زبان بات کرنے کو برابر ترستی ھے - ایک کاوش اندر سے اظہار کا تقاضا کرتي رھتی ھے - گو اس کیفیت کا مکمل اظہار ، ناممکن ھے مگر تھوڑا بہت اظہار اشارہ کے طور پر ضرور ھوتا ھے - اس طرح اس کیفیت کے ماتحت جو آرٹ ظہور پذیر ھوتا ھے وہ اشاریہ ھوتا ھے یعنی وہ حقیقت کا مکمل ترجمان تو نہیں ھوتا بلکہ حقیقت کي طرف صرف اشارہ کرتا ھے - مثلاً اگر کوئی مصور ایک شمع بنائے اور یہ دکھائے کہ اس کے پر تو سے ساری فضا روشن ھوگئی تو اس سے یہ مطلب نہ ھوگا کہ واقعی کوئی شمع ایسی ھے جس سے سارا عالم روشن ھوسکتا ھے بلکہ اس سے مراد یہ ھوگی کہ اگر آپ کے دل کی شمع روشن ھوجائے تو آپ اس کی روشنی میں سارے عالم کو دیکھ سکتے ھیں - شمع سے مراد یہاں آپ کا دل ھے اس مثال کے باوجود شمع اصل حقیقت کو ظاھر نہیں کرتی بلکہ صرف ایک مثال دیتی ھے یا اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتي ھے - یہی وہ بلند مقام ھے جس کے ماتحت بڑے بڑے آرٹ کی تخلیق ھوئی ھے - چنانچہ شاعری ، مصوري ، ڈرامہ ، نقاشی ، بت تراشي کی ابتدا یہیں سے ھوئي اور بہتیرے باکمال صاحبان فن اسی جذبہ سے متاثر تھے - اگر مغربی نقادوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس منزل میں آرٹ کا قدم ڈگمگا جاتا ھے کیونکہ وہ اندرونی کیفیت کا مکمل طور پر یہاں اظہار نہیں کرتا اور مغربی نقادوں کے نزدیک اعلیٰ آرٹ وھی ھے جو اندرونی کیفیت کا مکمل طور پر اظہار کرے -

لیکن اس اشارہ کی کیا نوعیت ھوتی ھے ؟ یہ اشارہ ھمارے گرد و پیش کي چیزوں یا تاریخی روایات پر مبنی ھوتا ھے - ھم جو کچھ دیکھتے ھیں یا جن چیزوں سے ھم کو محبت ھوتي ھے ھم ان کو اشارہ کے طور پر استعمال

کرتے ھیں - مثنوي مولانا روم میں چرواھے اور حضرت موسیٰ کے قصہ میں چرواھے کی گفتگو اس کے اندروني کیفیت کي طرف اشارہ کرتي ھے - چرواھا ایک بیخودی کے عالم میں کہہ رھا ھے کہ اے خدا اگر تو ملتا تو میں تیرے کنگھی کرتا ' تجھے بھیڑ کا دودھ پلاتا اور بھیڑ کے اون کا کپڑا پہناتا - تجھکو نرم نرم گھاس پر سلاتا - دیکھئے چرواھے کے سامنے اشارہ کے لئے وھی چیزیں آتي ھیں جن سے اس کو روز سابقہ پڑتا ھے اور جس سے اس کو محبت ھے - یہاں کنگھی ' دودھ اور بھیڑ کا اون یہ الفاظ صرف اشارہ کے طور پر استعمال ھوئے ھیں - لفظي معنی سے یہاں بالکل واسطہ نہیں -

ایک صحیح النظر نقاد کا کام ھے کہ وہ پیکر سے زیادہ معاني کی طرف غور کرے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ جن کیفیتوں کے ماتحت یہ الفاظ ادا ھوئے ھیں وہ کیا ھیں اور الفاظ کا یہ پیکر تیار کرتے وقت صاحب فن کی روح کس کس طرح کي تمناؤں سے متاثر تھی اور کون کون سے رجحانات کام کر رھے تھے - اس لحاظ سے ضرورت ھے کہ نقاد میں ھمدردی کا جذبہ نہایت بلند ھو - اگر یہ نہ ھوا تو ممکن ھے کہ نقاد محاورہ کي کوئي غلطی ثابت کردے مگر اپنے اس جوش نکتہ چیني میں وہ یقیناً ایک بلند حقیقت سے نا آشنا رہ جائیگا اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام نہ دے سکیگا - نقاد نے اس منزل میں اگر صرف الفاظ سے معنی کا پتہ چلانے کی کوشش کی ھے تو وہ یقیناً راستہ بھٹک جائیگا ' پیکر کو وہ بے معنی کہدیگا اور اس کی سمجھ میں خاک نہ آئیگا کہ ایک چرواھا کس طرح خدا کو بھیڑ کا دودھ پلا سکتا ھے - اس کو کیا معلوم کہ چرواھے کے پہلو میں ایک بیقرار اور تڑپتا ھوا دل ھے جسکا اصلی اظہار ناممکن ھے اور جو کچھ ادا ھوا ھے وہ محض اشارہ کے طور پر ھے -

(۳)

جب صاحب فن کے دل میں احساس پیدا ہوتا ہے تو اس احساس کے

ہم آہنگی و وحدت

مختلف ٹکڑے آپس میں ملکر معنی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہوتی ہے اور تمام اجزاء متحد ہوکر ایک واحد کل کی شکل اختیار کرلیتے ہیں - یوں تو ہر چیز میں جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وحدت کی ایک شان پائی جاتی ہے - مثلاً درخت کی ایک پتی دوسری پتی سے بالکل الگ ہوتی ہے - نغمہ کی ایک تان دوسری سے مختلف ہے - پھول کی دلفریبی کچھ اور دریا کا لطف کچھ اور ہے - لیکن یہاں وحدت سے مراد وحدت فی الکثرت ہے - اس وحدت کی دو قسمیں ہیں - اول احساس کی وحدت - دوم آرٹ کی وحدت - احساس کی وحدت تو یہ ہوئی کہ احساس کے مختلف حصے اس طرح ہم آہنگ ہوں کہ وہ واحد ہو جائیں - فرض کیجئے آپ صبح کے وقت کسی پہاڑ پر کھڑے ہیں سامنے دور تک سمندر پھیلا ہوا ہے - اتنے میں سورج سامنے سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی کرنوں کے اثر سے آسمان پر اُڑتے ہوے بادل کبھی سرخ اور کبھی نارنجی قبا اوڑھ لیتے ہیں - خوشگوار ہوا جب سطح آب کو چھیڑتی ہے تو ہلکی لطیف موجیں اُٹھتی ہیں - ساتھ ہی پہاڑ سے ایک طرح کی خوشبو نکل رہی ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے - آپ ان چیزوں کا لطف اٹھاتے ہیں - یہ تمام چیزیں آپ کے کان ، آنکھ ، ناک پر اول اول اپنا اثر ڈالتی ہیں لیکن جب یہ چیزیں آپکی روح کی گہرائی میں اترتی ہیں تو اس تمام منظر کا اثر کچھ اس طرح آپس میں مل جاتا ہے کہ آپ ایک چیز کے اثر کو دوسری چیز کے اثر سے الگ نہیں کرسکتے - ان میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اور

اس وقت یہ منظر نہ تو صرف سمندر ہوتا ھے ' نہ پہاڑ اور نہ آسمان بلکہ ان تمام چیزوں سے ملکر ایک مکمل منظر بنتا ھے جس میں وحدت کی شان پائی جاتی ھے - اس واحد منظر سے آپ کو لطف ملتا ھے کیونکہ آپکو اس میں قدر نظر آتی ھے - یہ احساس کی وحدت آپکی روح کا فیض ھے - جب تک وحدت کی یہ شان نہیں پیدا ہوتی اُس وقت تک احساس نامکمل اور مبہم ہوتا ھے - دوسری قسم آرٹ کی وحدت ھے یعنی احساس کی اس ہم آھنگی و وحدت کا اظہار آرٹ میں ہوتا ھے - آرٹ کا مقصد ھے کہ صورت کے ذریعہ معنی کا اظہار ہو - آرٹ جہاں تک جذبات کو متشکل کرتا جائیگا وہاں تک کامیاب سمجھا جائیگا - یہ آرٹ کا کمال ھے کہ احساس کو صورت کے طلسم میں اسیر کر دے - اس لحاظ سے جو وحدت احساس میں موجود ھے وہ آرٹ میں بھی ضرور نمایاں ہوگی - جس طرح احساس کے مختلف ٹکڑے آپس میں متحد ہوکر وحدت پیدا کرتے ہیں اسی طرح آرٹ میں ایک جزو کا دوسرے سے گہرا تعلق ہوتا ھے اور اجزا کے اس ربط و اتحاد سے ایک کُل بنتا ھے جسکی جھلک جزو میں صاف نمایاں ہوتی ھے - مغربی نقاد ان جمالیات اس امر پر زور دیتے ہیں کہ جب تک آرٹ مکمل طور پر جذبات کی صورت گری نہ کر لے اس وقت تک وہ نامکمل اور بدصورت رہتا ھے - ان کے اقوال کے مطابق آرٹ کا ایک حسین نمونہ تیار کرنے کے لئے گویا جذبات کی مکمل صورت گری ممکن ھے - اِس پر آیندہ صفحات میں بحث کی جائیگی -

آرٹ کی دنیا میں اس ہم آھنگی و وحدت کے حصول کے لئے چند طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جنکو صورت گری کہتے ہیں - اس صورت گری میں ترتیب کا عنصر خاص طور پر نمایاں ہوتا ھے - فطرت انسانی کا یہ خاصہ ھے کہ صاحب فن آرٹ کی تخلیق کے وقت خود ایک طرح کا اندرونی ضبط اور ایک روک محسوس کرتا ھے اور یہی ضبط اس کے فن میں

ترتیب پیدا کرتا ہے اور مشق سے اس ترتیب پر جلا ہوتی ہے - یہ ضبط کوئی قاعدہ کے طور پر نہیں عائد کیا جاتا بلکہ یہ صحیح اظہار کا تقاضا ہے کہ جو چیز احساس کی ترجمانی کرے اس میں نظم ہو، ترتیب ہو تاکہ احساس وحدت کا صحیح صحیح اظہار ہوسکے - کسی صورت کے مختلف حصوں میں ہم آہنگی و ترتیب پیدا کرنے کے لئے مثلاً مصوری میں خطوط کا استعمال ہوتا ہے - ایک تصویر کے چاروں طرف خط کھینچ دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تصویر ہے اور یہاں تک یہ علیحدہ اور مکمل ہوگئی - پھر تصویر کے اندر مختلف خطوط کی کشش سے مختلف حصے آپس میں ملا دئے جاتے ہیں - اگر سر اور جسم کا جوڑ دکھانا ہے تو ایک خط اس کے لئے کافی ہے - اسی طرح شاعری میں ہم آہنگی کے لئے علیحدہ اصطلاحات ہیں - مثلاً ردیف، قافیہ، محاورہ، الفاظ کا برمحل استعمال وغیرہ - جب کسی شعر میں یہ چیزیں صحیح طور پر استعمال کی جائینگی تو اس شعر میں ہم آہنگی پیدا ہوگی اور وہ شعر اپنی جگہہ مکمل ہوگا - پھر اس ترتیب کا نتیجہ ایک شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور شکل کی مختلف قسمیں ہوگئی ہیں - مثلاً خط اور رنگ کی آمیزش و ترتیب سے مختلف قسم کی مصوری ہوسکتی ہے - ایک مصوری تو منظر کی ہوئی دوسرے چہرہ کی ہوئی جیسے ایران میں رائج تھی - تیسری قسم واقعات کی مصوری ہوئی جیسے قدیم ہندوستان میں رائج تھی - اور یورپ میں اب بھی رائج ہے - اسی طرح موسیقی میں مختلف راگ اور راگنیاں ہیں اور شاعری میں اوزان و بحور، قصیدہ، مسدس، مثنوی، رباعی اور غزل وغیرہ ترتیب کی مختلف قسمیں ہیں -

ایک باکمال صاحب فن کا فرض ہے کہ وہ اپنا تخلیقی عمل شروع کرنے سے قبل اپنے زمانہ تک کی اس صنف کی 'صورتوں' پر جس میں خود

وہ دلچسپی لیتا ہے ایک نظر ڈال جائے کیونکہ ان صورتوں کے مطالعہ سے
جس میں اس صنف کے صاحبان فن نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اسکی
مشق میں ترقی ہوگی - اگر وہ شاعر ہے تو اس کو اپنے زمانہ تک کے شعرا کے کلام
سے واقفیت ہونی چاہئے اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اصناف شاعری میں سے
کون سی ایسی صنف ہے جس میں وہ اپنے جذبات کا بہترین طور پر اظہار
کرسکتا ہے - اگر اسکی طبیعت مثنوی کی طرف راغب ہے تو اسکو مثنوی کہنا
چاہئے - غزل کی طرف لگاؤ ہے تو غزل اور نظم کی طرف مائل ہے تو نظم
کہنا چاہئے - لیکن اگر کسی موجودہ ظرف میں اس کے جذبات کی شراب
نہیں سما سکتی تو وہ لامحالہ کوئی دوسرا طرز اظہار اختیار کریگا - اگر وہ
اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا شاعر ہے - لیکن
بیشتر حالتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اب اس قسم کی ایجاد
کی گنجائش کم ہے - البتہ گنجائش اصلاح کی ضرور ہے اور وہ
ہر زمانہ میں رہیگی - ایجاد کی گنجائش اس لئے کم ہے کہ صدہا
شعرا صدہا سال سے مختلف شکلوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے چلے آئے
ہیں اور انہوں نے مشکل سے کوئی ایسی صنف باقی چھوڑی ہے جس میں
جدت کا مکمل طور پر کوئی انداز پایا جائے اس لئے جب کوئی شاعر کچھ
کہنا شروع کرتا ہے تو وہی پرانے اصناف سخن سامنے آتے ہیں اور وہ اپنی
طبیعت کے مطابق ایک صنف منتخب کرلیتا ہے اور اسی میں شعر کہتا
ہے - اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صنف معنی یا جذبات پر اظہار کے
وقت بیرونی طور پر پابندیاں عائد کرتی ہے - نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے -
صورت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معنی پر خارجی طور پر عائد کردی
جائے بلکہ اسکا رشتہ معنی کے ساتھہ تو جسم و روح کا ہے - جب معنی
لامحدود سے محدود میں قدم رکھتا ہے تو وہ ایک صورت اختیار کر لیتا

ھے - لیکن اگر کوئی شرق سے غزل کہتا ھے تو یہ سمجھنا چاھئے کہ یہ اس کی طبیعت کا بہترین طرز اظہار ھے - علاوہ بریں اگر ایک شخص غزل کا میدان اپنے لئے منتخب کرتا ھے تو وہ درحقیقت بڑے بڑے پیشرو شعرا کے جذبات میں شریک ھوتا ھے جو اس صنف میں شعر کہہ چکے ھیں - اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ جتنے بڑے بڑے غزل گو شعرا ھیں اُن میں کہیں نہ کہیں ایک طرح کی روحانی یگانگت پائی جاتی ھے - اس یگانگت کو معمولی درجہ کا نقاد اکثر سرقہ اور توارد کی بحث میں لاتا ھے اور کسی کو کسی پر فضیلت دینے کی کوشش کرتا ھے حالانکہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ھے -

اصناف شاعری اور مصطلحات شاعری کو اگر قیود کہا جائے تو ان ' قیود ' سے شاعر کی رھنمائی مقصود ھے کیونکہ اصل ضرورت تو معنی کا اظہار ھے اور یہ اظہار صورت کے ذریعہ ھوتا ھے - اس لئے بہترین صاحب فن وہ ھے جو معنی و صورت میں بہترین طریقہ پر ھم آھنگی پیدا کرتا ھے - جب یہ ھم آھنگی پیدا ھوتی ھے تو اس وقت صورت و معنی اس طرح آپس میں پیوست ھوجاتے ھیں کہ یہ بتانا سخت مشکل ھو جاتا ھے کہ کون سا حصہ معنی کا ھے اور کون سا صورت کا کیونکہ آرٹ نہ تو اسوقت پوری طرح مادی ھوتا ھے نہ روحانی بلکہ روح اور مادہ کا معتدل امتزاج ھوتا ھے - آرٹ کی دنیا میں اس امتزاج سے جو چیز بنتی ھے وہ حسین کہلاتی ھے اور جو صاحب فن اپنے آرٹ میں یہ کیفیت حاصل کرلیتا ھے وہ صاحب کمال ھوتا ھے -

(۴)

حسین اور بد صورت کا تعلق

جیسا ھم بتا چکے ھیں آرٹ کی دنیا میں معنی اور صورت کی ھم آھنگی سے حسین چیز تیار ھوتی ھے اور اس میں ایک کُل کی شان پائی جاتی ھے - کل کی یہ کیفیت اجزاء کی کیفیت کی آئینہ دار ھوتی ھے - یعنی اگر کسی

خاص جزو پر نسبتاً زیادہ زور دیا گیا ھے یا کسی جزو کو زیادہ واضح کیا گیا ھے تو کل پر اس کا اثر پڑنا لازمی ھوگا - پھر اجزا آپس میں کس طرح ملتے ھیں اسکی جھلک بھی کل میں ظاھر ھوگی - پھر صاحب فن کی مشق اور صورت گری کے لوازم کو صحیح صحیح استعمال کرنے پر بہت کچھ کل کا دار مدار ھوتا ھے - اگر صاحب فن ایک باکمال مصور ھے تو رنگوں کی آمیزش اور نقوش کی دلفریبی میں اسکی چابکدستی نمایاں ھوگی - اگر شاعر ھے تو الفاظ کے انتخاب ' بندش کی چستی اور صفائی وغیرہ کا اثر تمام کلام پر پڑیگا - جس طرح کسی تصویر پر ظاھری رنگ و روغن کا اثر پڑتا ھے اسی طرح اس کا بھی اثر پڑتا ھے کہ صاحب فن کس خیال کو ادا کرنا چاھتا ھے اور کون سے معنی کو فن کا جامہ پہنانا چاھتا ھے - اور جو کچھ وہ ظاھر کرنا چاھتا ھے آیا وہ کوئی بڑا یا معمولی ' ناقص یا تکلیف دہ خیال ھے - اگر کسی بڑے خیال کو خوبی سے فن میں منتقل کردیا گیا ھے تو وہ فن نہ صرف کامل بلکہ عظیم ھوتا ھے - لیکن اگر خیال معمولی ھے اور اس کے حسب حال فنی آرائش کردی گئی ھے تو فن میں کمال تو ھوگا مگر عظمت نہ ھوگی - پھر کل پر اس کا اثر بھی پڑیگا کہ اس کل میں معنی پر زیادہ زور دیا گیا ھے یا صورت پر - آرٹ میں ایسے نمونے بہت مل سکتے ھیں جہاں نسبتاً یا تو معنی پر زور دیا گیا ھے یا صورت پر - اول معنی پر زور دینے کی مثال لیجئے :—

جلا ھے جسم جہاں دل بھی جل گیا ھوگا
کریدتے ھو ' جو اب راکھ، جستجو کیا ھے

خدا شرمائے ھاتھوں کو کہ رکھتے ھیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

یا آتش کا یہ مصرع—درد درماں سے المضاف ہوا -

ان اشعار میں معنی پر بہ‌نسبت صورت کے زیادہ زور دیا گیا ہے جس کا اثر کل پر پڑا ہے اور کل میں کچھ ' خامی ' ہوگئی ہے - اسی طرح جہاں صورت پر بہ‌نسبت معنی کے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہاں صورت تو آگے بڑھ جاتی ہے اور معنی پیچھے رہ جاتا ہے - اس حالت میں ایک طرح کا بھدا پن ظاہر ہوتا ہے - مثلاً :—

سر شکم بے تو رفتہ رفتہ در یاشد تماشا کن
بیادر کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن

کہنا صرف اتنا ہے کہ میں تیرے فراق میں بہت رویا مگر شاعر نے بیان میں اتنا مبالغہ کیا کہ آنسوؤں کو دریا کر دیا اور پھر دریا سے کشتی کا خیال آیا اور معشوق کو کشتی چشم میں سیر کی دعوت بھی دیدی گئی - یہاں تھوڑے سے معنی کو الفاظ کا بہت بڑا جامہ پہنا دیا گیا ہے جس سے کل پر اثر پڑا اور کل انمل بے جوڑ سا ہوگیا - اسی طرح کسی کا شعر ہے :—

باغ کو پاکے آئینہ حسن و جمال یار کا
مجھکو جنون ہوگیا نام ہوا بہار کا

یہاں معنی اچھا خاصا بلند ہے مگر شعر پڑھنے کے بعد بجائے معنی کے آپ کا ذہن اس ٹکڑے پر کہ "نام ہوا بہار کا" فوراً چلا جاتا ہے اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ واہ ! کیا بات ہے - کام کسی نے کیا اور نام کسی کا ہوا - اصل معنی یعنی باغ جو حسن یار کا آئینہ تھا اور جس سے مجھکو جنوں ہوگیا پس پشت پڑ گیا - اب خیال بس اسی طرف ہے کہ بہار کا نام کیوں ہوا - یہاں الفاظ کے اس ٹکڑے "نام ہوا بہار کا"

پر زور دینے کی وجہ سے ایک طرح کا سقم پیدا ہوگیا ہے جس کا اثر سارے شعر پر پڑا اور اس اثر نے اس شعر کو اصل معنی سے ہٹا کر بذلہ سنجی یا Wit کی حد میں داخل کردیا ہے -

لیکن جہاں معنی و صورت میں ہم آہنگی ہوتی ہے آرٹ کی دنیا میں وہاں حسین چیز نمایاں ہوتی ہے - مثلاً :—

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ معنی و صورت میں کمال ہم آہنگی ہے -

آرٹ کا کمال ہے کہ معنی کا اظہار بہترین طور پر ہو - جب صورت سے معنی کا اور معنی سے صورت کا اظہار ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اظہار کا کمال ہے - اس وقت صورت معنی کا اور معنی صورت کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے - جب آرٹ میں اس طرح دونوں کا باہم اتصال ہوتا ہے تو ہم اس کو حسین کہتے ہیں - لیکن مغربی نقادوں کے بقول جب معنی کا اظہار صورت میں مکمل طور پر نہیں ہوتا تو آرٹ بدصورت ہوجاتا ہے گویا بدصورتی کا معیار نامکمل اظہار ہے - بدصورتی قطعی نہیں بلکہ ایک اضافی چیز ہے - یہ اضافیت شخصیت کے اختلاف ، زمانہ کے اختلاف اور ماحول کے اختلاف پر مبنی ہوتی ہے - یعنی جو چیز آج زید کو بدصورت اور ناگوار معلوم ہوتی ہے ممکن ہے وہی چیز بکر کو حسین معلوم ہو اور ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد خود زید کو حسین معلوم ہونے لگے - ایک ہی زمانہ میں ایک ہی چیز کو نگاہ کے مختلف زاویوں سے دیکھنا ذرا مشکل بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماحول کی تبدیلی اور زمانہ کے تغیر بغیر زاویہ نگاہ نہیں بدلتا اور تغیر کے بعد

ممکن ھے کہ جو چیز پہلے بدصورت رھی ھو بعد کو حسین معلوم ھونے لگے - مرزا غالب کا کلام اس کي بین مثال ھے - خود مرزا کے زمانہ میں لوگ ان کی مشکل گوئي کا مذاق اڑاتے تھے کہ وہ مہمل گو ھیں لیکن سچ پوچھئے تو واقعہ یوں تھا کہ وہ نفسی حیثیت سے اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے - جب زمانہ نے پلٹا کھایا ' ماحول بدلا اور نئے نئے علوم کي روشنی نمودار ھوئی تو مرزا کی شخصیت اس روشنی میں اور زیادہ نمایاں ھوگئی - مرزا کی اکثر غزلیں اور اُن کے اکثر اشعار ایسے ھیں جن کا مطلب ایک ماھر نفسیات بہ‌نسبت ایک عامي کے بہتر سمجھ سکتا ھے - مرزا کی اس غزل

سوزش باطن کے ھیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ھے

کا مطلب کتنا مشکل نظر آتا تھا لیکن جب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوري نے فرانس کے مشہور فلسفی برگسان کی سند پیش کی تو معلوم ہوا کہ مرزا کا قول بالکل درست ھے اور جو چیز پہلے بدصورت معلوم ھوتي تھی وہ اب عین حسن ھوگي - اس میدان میں غلطی اکثر یوں ھوتی ھے کہ اکثر لوگ جلدي میں صرف ظاھري پیکر کے بعض پہلو دیکھکر فوراً کل معنی پر حکم لگا دیتے ھیں اور شاعر کی اندرونی کیفیتوں اور کاوشوں کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے - ڈاکٹر اقبال کي شکایت اس معاملہ میں بالکل بجا ھے کہ

کم نظر بے تابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہا نم نہ دید

اس لحاظ سے قطعی یا مطلق بدصورتی ناممکن ھے - ممکن ھے کوئی جزو محض جزو کی حیثیت سے بدصورت ھو لیکن مجموعی حالت سے

اس کائنات میں کوئی چیز بدصورت نہیں - مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ایک تازہ تصنیف میں فرماتے ھیں :—

" یہ دنیا عالم کون وفساد ھے—یہاں ھر بننے کے ساتھ بگڑنا ھے اور ھر سمٹنے کے ساتھ بکھرنا - لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ھوتا ھے کہ خوبی و دل آویزی کا ایک پیکر تیار کر دے اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اسی لئے ھے تاکہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے - تم ایک عمارت بناتے ھو لیکن اس بنانے کا کیا مطلب ھوتا ھے ؟ کیا یہی نہیں ھوتا کہ بہت سی بنی ھوئی چیزیں ' بگڑ گئیں ' - چٹانیں اگر نہ کاتی جاتیں اور بھٹے اگر نہ سلگائے جاتے ' درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاھر ھے عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا - پھر یہ راحت و سکوں جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ھوتا ھے کس صورت حال کا نتیجہ ھے ؟ یقیناً اسي شور و شر اور ھنگامۂ تخریب کا جو سرو سامان تعمیر کی جدو جہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا - اگر تعمیر کا یہ شور وشر نہ ھوتا تو عمارت کا عیش و سکون بھي وجود میں نہ آتا......
اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کی زندگي وشادابی کے لئے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا - اگر بادل کي گرج اور بجلي کی کڑک نہ ھوتي تو باران رحمت کا فیضان نہ ھوتا - اگر آتش فشان پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ھوا مادہ کرہ کی سطح کو پارہ پارہ کردیتا.....فطرت کی سب سے بڑي بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ھے - فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ھی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ھے کہ اس کے ھربناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ھر ظہور میں نظر افروزي و روح پروری کی نمود پیدا ھوگئي ھے - کائنات ھستی کو اس کی مجموعي حیثیت سے

دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشہ خلقت پر نظر ڈالو - اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن و رعنائي نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈالدی ہو - غرضکہ تمام تماشا گاہ ہستی حسن کی نمایش اور نظر افروزي کی جلوہ گاہ ہے - "

اسی لحاظ سے مجموعی طور پر دنیا میں اگر کسی چیز پر نظر ڈالی جائے تو وہ کبھی بدصورت نظر نہ آئیگی - لیکن اگر کسی جزو کو کل سے علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو اس میں بدصورتی کا امکان ہے - پھر ایک جزو دوسرے جزو سے موازنہ و مقابلہ کے وقت بہتر اور حسین تر نظر آسکتا ہے - یعنی ایک جزو دوسرے سے نسبتاً ناممکمل اور بے ترتیب اور اس لئے بدصورت ہوسکتا ہے - لیکن اس بدصورتي کا دار مدار طرز نظر پر ہے اور جہاں تک اس بدصورتي کا اثر کسی کی طرز نظر سے وابستہ ہے یہ فرق بالکل حقیقي ہے اس لئے بدصورتی کتاب حسن کا ایک باب ہے - اس کتاب سے الگ ہوکر اسکی کوئي حیثیت نہیں یعنی ایک چیز جہاں تک ناممکمل ہے بدصورت ہے اور جب یہ چیز ترتیب اور کمال حاصل کرلیتی ہے تو حسین ہوجاتی ہے - ڈاکٹر بوسنکٹ کا قول ہے کہ اسی قسم کي بدصورتی کا ایک نمونہ اور بھی ہے یعنی جہاں صحیح جذبات نہ ہوں لیکن صحیح اظہار کی نقل کی جائے وہاں بدصورتی کا ظہور ہوتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معنی اور صورت سے ہم آہنگی اٹھ جاتی ہے اور آرٹ کا ایک بدصورت نمونہ نمایاں ہوتا ہے - اگر صحیح اور مخلص جذبات سے متاثر ہوئے بغیر پر اثر طرز اظہار کی کوشش کي جائے یا کسی شاعر کا کلام سامنے رکھکر اس کی نقل کی جائے تو جو چیز ظاہر ہوگی وہ ناممکمل اور بے ترتیب ہوگي اور اس لئے بدصورت ہوگي - اور یہ کوشش کبھی کامیاب بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ نقل کرنے والا بازیگري کے اچھے کمالات شاید مشق سخن سے دکھا

دے مگر وہ دل اور جذبات نہیں رکھتا جس سے اچھے شعر نکلتے ہیں - مثال کے طور پر آپ فارسی میں شفائی کا کلام لیجئے - علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ انہوں نے غزل میں جذبات درد اور سوز و گداز کی نقل کرنے کی بہت کوشش کی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نری نقّالی اور کاغذی پھول بن کر رہ گئے - اردو میں بھی ایسے 'شعرا' بہت مل سکتے ہیں جو ایک مصرع طرح دیئے پر دم بھر میں سیکڑوں ایسے اشعار موزوں کر دیں جو زبان و محاورہ ' بندش و صفائی کے لحاظ سے تو بہتر معلوم ہوں مگر ان اشعار میں جذبات مفقود ہوں یعنی یہ معلوم نہ ہوسکے کہ جو شاعر کہہ رہا ہے اسے محسوس بھی کر رہا ہے - ایسے "شعرا" کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بدصورت چیز کے پیدا کرنے میں بڑی مہارت حاصل کی ہے اور غزل کے رنگ کا شعر موزوں کر دیتے ہیں - یہی وہ کاغذی پھول ہیں جو کسی سادہ دل کو شاید تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور دھوکے میں ڈال دیں مگر ایک صاحب نظر ان سے فوراً آگاہ ہوجاتا ہے -

مغربی نقادوں کی غلطیاں

آج کل مغرب میں اطالیہ کا مشہور فلسفی کروچے جمالیات کے نقادوں کا سر گروہ مانا جاتا ہے · اس کے نظریوں نے فن نقد پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے اور موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام بڑے بڑے نقاد اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں - اس کی تحریروں نے اس تاریک مگر دلفریب راستہ میں نہ صرف مشعل کا کام کیا ہے بلکہ راستہ بھی بڑی حد تک ہموار کیا ہے - کروچے کا قول ہے کہ معنی کا ذریعہ الہام اور بصیرت ہے اور چونکہ اس کے خیال کے مطابق یہ بصیرت مکمل طور پر آرٹ میں الہام کے وقت ہی نمایاں ہوتی ہے اس لئے آرٹ بھی الہام ہوا - یعنی جو صاحب نظر ہے وہی اعلی درجہ کا صاحب فن بھی ہوسکتا ہے - پھر وہ کہتا ہے کہ آرٹ کا کمال یہ ہے کہ معنی کا

مکمل طور پر صورت کے ذریعہ اظہار ہو اور جب یہ اظہار ہوتا ہے تو معنی اور صورت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا گویا صورت معنی کا دوسرا نام ہے - جو معنی ہے وہی صورت ہے - مکمل اظہار کے وقت آرٹ حسین ہوتا ہے لیکن اگر ذرا بھی اظہار میں خامی رہ گئی تو آرٹ اس حد تک بد صورت رہیگا -

ہم الہام پر پہلے لکھ چکے ہیں - یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جب کسی شخص پر یہ الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت وہ ایک بیخودی کے عالم میں ہوتا ہے - اس کے ظاہری حواس بڑی حد تک مختل ہوجاتے ہیں - اس وقت وہ ایک دوسری دنیا میں ہوتا ہے جہاں عالم کی حقیقت اور زندگی کا راز اس پر منکشف ہوتا ہے - اس وقت اس کو شاید ہی یہ خیال گذرتا ہو کہ وہ فوراً اس کیفیت کا اظہار کرے - یہ کیفیت چونکہ دیر تک قائم نہیں رہتی اس لئے جب وہ اپنے ظاہری حواس کی سرحد میں واپس آجاتا ہے تو پھر اسکو "بادۂ شبانہ" کی سر مستیاں یاد آتی ہیں اور تخیل و تصور سے کام لیکر وہ صورت گری کرتا ہے اور ان حقائق کی تشکیل کرتا ہے اور چونکہ اس پر بہت کچھ اس 'خواب' کا اثر باقی رہتا ہے اس لئے الفاظ میں وہی جذباتی شان پائی جاتی ہے - اگر آپ ایسے اصحاب کے حالات اور ان کے مراقبوں کی کیفیتوں کا حال پڑھیں تو ان سے معلوم ہوگا کہ جب ان لوگوں پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی تو ظاہری طور پر وہ بالکل بے خبری کے عالم میں ہوتے تھے اور ان کو اس وقت اس کا خیال تک نہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ ظاہر کریں - اظہار کا خیال تو بعد کی کیفیت ہے - اس لحاظ سے فن بذاتہ الہام نہیں بلکہ اس الہام کی ایک تخئیلی تصویر ہوتی ہے - لیکن

یہ تصویر بہت کچھ صحیح تصویر ہوتی ہے اور اصل کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اصل کی یاد دلاتی ہے -

دوسری بات کروچے کے قول کے مطابق یہ ہے کہ معانی کا جلوہ مکمل طور پر صورت میں ظاہر ہوتا ہے - وہ کہتا ہے کہ "بعض لوگوں کا یہ خیال کتنا تمسخر انگیز ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے ذہن میں کوئی بڑا خیال آیا ہے مگر وہ ظاہر نہیں کرسکتے یا کسی عمدہ اور اچھی تصویر کا نقشہ سمجھ میں آیا ہے مگر اس کو کاغذ پر نہیں اتار سکتے" - وہ کہتا ہے کہ جب تک بڑا خیال مکمل طور پر متشکّل نہ ہوجائے وہ کوئی بڑا خیال ہی نہیں ہے - اس کے خیال میں معنی کا عدم اظہار معنی کی خامی کی دلیل ہے - لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بڑے خیالات کا مکمل طور پر اظہار ناممکن ہے - ممکن ہے کسی معمولی چیز کا خاطر خواہ اظہار ہوجائے اور ہوتا بھی ہے لیکن جس کا سینہ اس عالم آب و گل کی راز داری کریگا ' جس کی نظر زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا ہوگی اس کی زبان بڑی حد تک گنگ ہوجائیگی - اس سے مکمل اظہار ناممکن نہیں بلکہ محال ہے - وہ جانتا ہے مگر دوسروں کو بتا نہیں سکتا -

بسیار شیوہ ہاست بتان راکہ نام نیست

جب گوتم بدھ سے اسکے چند چیلوں نے موت کے بعد کی کیفیات کا کچھ حال دریافت کیا تو بدھ جی نے خاموشی اختیار کی اور خاموش رہنے کی تلقین بھی کی - اس خاموشی کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ اس چیز سے بے خبر تھے بلکہ خاموشی ہی ان سوالات کا جواب تھی یعنی ان سوالات کا جواب کسی غیر سے نہیں مل سکتا بلکہ جواب خود ایک ناقابل اظہار طریقہ پر روح پر منکشف ہوجائیگا - اسیطرح جب پیغمبر اسلام سے لوگوں نے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور خاموش ہوگئے -

انسان کی روح جب حقیقت کا پتہ لگاتی ہے تو اُس وقت اس سے حقیقت کا مکمل اظہار نہیں ہوسکتا - اس علم کا تقاضا ہے کہ انسان خاموش رہے - مرزا غالب کہتے ہیں :—

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

حقیقت چونکہ بے شکل اور بے صورت ہے اس لئے اسکو مکمل طور پر صورت کے طلسم میں اسیر کرنا محال ہے - لیکن صاحب فن کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک عالم کی چیز کو دوسرے عالم کی چیزوں کی مدد سے رنگ بدل کر تھوڑا بہت ظاہر کرتا ہے اور آرٹ میں جب اس کا ظہور ہوتا ہے تو آرٹ اشاریہ ہوجاتا ہے یعنی آرٹ اس حقیقت علوی کو بتاتا تو نہیں مگر اس کی طرف اشارہ کردیتا ہے - صرف اس اشارہ میں ہزاروں اظہار پوشیدہ ہوتے ہیں - خیام نے کہا ہے :—

قدرِ گل و مل بادہ پرستان دانند
نے تنگ دلان و تنگ دستان دانند
از بے خبری بے خردان معذور اند
ذوقے ست دریں بادہ کہ مستان دانند

اس لحاظ سے حقیقت کا مکمل نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ اشارۃً اظہار تو ضرور ہوتا ہے - بقول اصغر :—

حسن ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں
کچھ جھلک اس کی سر پردۂ مینا دیکھیں

اگر کروچے کے قول کو سند تسلیم کرلیا جائے تو یہ نامکمل اظہار آرٹ کی بدصورتی ہوگی حالانکہ ایک اہل نظر کے لئے یہ حسن کا مخزن ہے - آپ آگ جلاتے ہیں تو لکڑی کے جلنے کے بعد آپ کے

سامنے راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے - آپ رات کو شمع روشن کرتے ہیں تو پروانے آکر جلتے ہیں اور جل کر راکھ ہوجاتے ہیں - صبح کے وقت شمع کے پاس بھی راکھ کا ایک ڈھیر ہوتا ہے - لکڑی کی راکھ اور پروانوں کی راکھ دونوں بہر حال راکھ ہیں - ایک عامی شاید ان میں تمیز نہ کرسکے لیکن ایک اہل نظر فوراً سمجھ لیگا کہ پروانہ کی راکھ کچھ اور کہہ رہی ہے - اس کی راکھ میں بیقراری اور اضطراب کے افسانے ہیں جو زبان حال سے بیان ہو رہے ہیں - پھر کون ہے جو اس خاموشی کو عدم اظہار سے تعبیر کریگا - میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حسن اور بدصورتی کا دار و مدار نظر پر ہے - پھر کہا یہ مشرق و مغرب کے طرز نظر کا فرق نہیں ہے -

موجودہ دور کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے :—

دل مرا توڑ کر کہا اس نے زبان راز میں
ساز میں نغمے وہ کہاں جو ہیں شکست ساز میں

(۵)

صاحب فن کی بزرگی و عظمت

ہم بتا چکے ہیں کہ فن میں کمال کے کیا معنی ہوتے ہیں یعنی جب صاحب فن مناسب طریقہ پر معنی اور صورت کا اتصال کرتا ہے تو اس کا یہ عمل درجہ کمال پر پہونچتا ہے - لیکن ایک چیز اور بھی ہے جو اس کمال میں شامل بھی ہے اور الگ بھی اور وہ صاحب فن کی بزرگی و عظمت ہے - یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شاعر شاعری میں کمال رکھنے کے باوجود بڑا شاعر نہ ہو یعنی اس کے الفاظ موزوں اور معنی ساجھے ہوئے ہوں مگر وہ بڑا شاعر نہ ہو - یہ صورت عام ہے اور تقریباً ہر 'کہنہ مشق' شاعر کا شمار اس گروہ میں ہوسکتا ہے - دوسری صورت یہ ہے کہ کمال کے

ساتھ ساتھ بڑا شاعر بھی ہو - یہ صورت بہت مشکل اور تقریباً محال ہے - تیسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور بندش کی صفائی میں کچھ کمی رہ گئی ہو مگر وہ شاعر بزرگ ہو - جزو کی اس خامی سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل مکمل طور پر ناقص ہوگیا - مرزا غالب کا کلام دیکھئے - وہاں محاورات کا پورا اہتمام نہیں - اکثر نامانوس و غریب الفاظ بھی آجاتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کو شاعر اعظم تسلیم کرنے میں کون انکار کرسکتا ہے - برخلاف اس کے مصحفی ' جرأت و ناسخ وغیرہ کا کلام دیکھئے - کیل کانٹے سے لیس ' قاعدہ کی پابندی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا ہے - الفاظ کے درو بست میں کافی اہتمام ہے - بالخصوص ناسخ کا کلام تو محاورہ کی غلطیوں سے بہت بڑی حد تک پاک ہے مگر اس کے باوجود کیا ان کو شاعر اعظم تسلیم کیا جاسکتا ہے ؟ نہیں ' ہرگز نہیں - کیونکہ ان کا کلام مجموعی طور پر معنی کی بلندی سے خالی ہے - اگر بڑے شعرا کے کلام کا استقراء کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعرانہ عظمت ان کے پیکر سے زیادہ ان کی معنویت میں پنہاں ہوتی ہے - یعنی جس قسم کے خیال کا اظہار ہوا ہے وہ کوئی بڑا خیال ہے اور اس خیال میں نفس انسانی کے کتنے دقیق و نازک مسئلے حل ہوئے ہیں - اس میں انسان کو خود اپنی صورت نظر آتی ہے - معلوم ہوا کہ شاعرانہ عظمت کے لئے ضرورت ہے بزرگ معنی کی ' بزرگ خیال کی -

آپ کچھ اشعار پڑھتے ہیں یا متعدد تصاویر دیکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ کس شعر میں یا کس تصویر میں کوئی بڑا خیال ادا کیا گیا ہے - مثلاً جب یہ اشعار پڑھے جائیں :—

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

----- ۱

ر دکھلوں کا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سر و چراغاں کا ر

تو آپ سمجھتے ہیں کہ موخرالذکر کے شعر میں حزن و یاس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بہ نسبت پہلے شعر کے نفس انسانی سے قریب تر ہے اور اس لئے آپ پر اسکا اثر ہوتا ہے اور آپ شاعر کی عظمت کے قائل ہوجاتے ہیں - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فن اور زندگی کے درمیان ایک باطنی رشتہ ہے اور اس رشتہ کے ذریعہ فن کی برابر آبیاری ہوتی رہتی ہے - اگر یہ آبیاری نہ ہو تو فن بھی بزرگ نہ ہو - لیکن نفس مضمون میں عظمت کی کیا پہچان ہے ؟ اگر یہ کہا جاے کہ انسان کھاتا ہے ' پیتا ہے ' سوتا ہے ' ہنستا ہے ' روتا ہے تو یہ ایک معمولی حقیقت کا اظہار ہوا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر یہ کہا جائے کہ انسان زندگی و موت اکی حقیقتوں پر غور کرتا ہے ' اپنے دل کے راز ہائے سر بستہ کے جاننے میں سر گرداں ہے ' رنج و غم کے اسباب جاننا چاہتا ہے نیکی اور بدی کی اصلیت سے واقف ہونے کی تمنا رکھتا ہے تو یہ بڑی حقیقتیں کہی جائینگی - عظمت کا تقاضا ہے کہ انسان اور کائنات کے تمام ممکن پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے اور ان کو کل کی حیثیت سے دیکھا جائے - اور بلند کو بلند اور پست کو پست کہا جائے - اس حفظ مراتب ہی سے نظر میں بلندی پیدا ہوتی ہے - اس لحاظ سے عظمت کے لئے ضروری ہے کہ جو صورت بنائی گئی ہے وہ فطرت انسانی کی بے شمار باریکیوں اور گہرائیوں کی ہم آہنگی کے ساتھ ترجمان ہو - گویا صورت ایک آئینہ ہو جس میں انسان اپنی مکمل ہستی دیکھ سکے - یہ آئینہ جتنا ہی صاف و شفاف ہوگا اتنا ہی صورت صاف نظر آئیگی اور اتناھی آئینہ ساز کی بزرگی اور عظمت پر دال ہوگی - انگلستان کے

مشہور شاعر شیکسپیر کا شمار (حالانکہ صورت گری یعلمی زبان ' محاورہ و طرز ادا کی اس کے یہاں میں بہت خامیاں ہیں) دنیا کے بڑے شاعروں میں اسی لئے ہوتا ہے کہ اس نے فطرت انسانی کے چہرہ سے نقاب الٹ دی ہے اور اپنے ڈراموں کے ذریعہ اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس پر حقیقت کا عکس پڑتا ہے -

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری طبیعت آخر عظمت کی طرف کیوں رجوع ہوتی ہے اور کیوں بزرگی کی طرف بڑھتی ہے - بات یہ ہے جیسا کہ ایک مشہور فلسفی لانجینس کا قول ہے کہ انسان کے اندر ایک ناقابل تسخیر خواہش پیدا کی گئی ہے جو اسکو ہمیشہ اپنے سے بلند ' برتر اور مافوق الفطرت چیز کی طرف لیجاتی ہے - یہ خواہش تخیل کے زور سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو ایک ایسی بلند اور برتر فضا میں پرواز کی دعوت دیتی ہے جہاں سے کل کا نظارہ ہوسکے - شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہم دریا کے مقابلہ میں سمندر اور میدان کے مقابلہ میں پہاڑ دیکھتے ہیں تو دل بے اختیار سمندر کی گہرائی اور پہاڑ کی بلندی کی طرف کھنچتا ہے - قطرہ کی خواہش ہوتی ہے کہ دریا سے اور ذرہ کی خواہش ہوتی ہے کہ آفتاب سے مل جائے اور دونوں کی یہ خواہش مطابق فطرت ہے اور دونوں کے عظمت کی دلیل بھی یہی ہے - گوئٹے نے بھی ایک جگہہ کہا ہے کہ ' ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شے ہماری روحوں کو ابدی مسرت کا نغمہ چھیڑ کر بیدار کردے ' مرزا کہتے ہیں -

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرہ سے اناالبحر کی صدا نکلنا قطرہ کی عین فطرت ہے اور جب یہ صدا نکلتی ہے تو اس سے قطرہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے - علامہ اقبال فرماتے ہیں :

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو

یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بیکنار کر

فطرت کا یہ راز جس صاحب فن کی صنعت میں نمایاں ہوتا ہے وہی صاحب فن بزرگ ہوتا ہے کیونکہ اس کی صورت گری میں معنی کا کمال نظر آتا ہے -

لیکن یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب معنی اپنے کمال پر پہونچتا ہے تو صورت میں خامیاں رہ جاتی ہیں - یہ خامیاں کیوں ہوتی ہیں ؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ صاحب فن سوسائٹی میں پلا ہے ' بڑھا ہے اور الفاظ و محاورہ وہی استعمال کرتا ہے جس کو سب استعمال کرتے ہیں یعنی صورت گری کا جو سامان وہ استعمال کرتا ہے اس پر سراسر اجتماعی رنگ غالب ہوتا ہے مگر اس کے جذبات ایک حد تک انفرادی ہوتے ہیں اس لئے اپنے جذبات کو اجتماعی رنگ میں ظاہر کرنے میں اس کو بڑی دقت ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے پیکر میں خامیاں باقی رہ جاتی ہیں - دوسری وجہ جیسا اکثر لوگ سمجھتے ہیں یہ ہے کہ صاحب فن پیکر تراشی کے اعلی اصول سے واقف نہیں ہوتا اس لئے غلطی کرتا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ یوں ہے کہ صاحب فن پیکر تراشی کے اصول سے ناواقف نہیں ہوتا بلکہ اس کے معانی اجماع کے مطابق تیار کئے ہوئے پیکر میں سما نہیں سکتے - اس لئے وہ اپنا راستہ الگ نکال لیتا ہے - ایک بزرگ صاحب فن اپنے زمانہ کے لوازم پیکر تراشی پر نگاہ ڈالتا ہے ' ان کو دیکھتا ہے اور جہاں تک اس کی طبیعت گوارا کرتی ہے وہاں تک ان لوازم کو

اپنے پیکر میں جذب کر لیتا ہے لیکن جہاں اس کے معنی بلند ہوتے ہیں وہاں وہ خود اظہار کے ذرائع پیدا کر لیتا ہے - اسی طرح اگر کسی بڑے شاعر میں اظہار کی خامیاں ہیں تو وہ اس لئے نہیں ہوتیں کہ وہ زبان و محاورہ سے بالکل ناواقف ہے بلکہ موجودہ محاورے اس کے جذبات کی تاب نہیں لاسکتے اس لئے اس کو شکست و ریخت سے کام لینا پڑتا ہے - علامہ اقبال کے اس شعر

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

پر بعض اصحاب اب تک معترض ہیں کہ سجدوں کا تڑپنا مہمل ہے اور یہ کوئی محاورہ نہیں - لیکن جس شخص پر یہ کیفیت نہ طاری ہوئی ہو وہ اس کیفیت کی حقیقت کیسے سمجھ سکتا ہے - میں پھر وہی شعر دھراؤں گا کہ

کم نظر بیتابی جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

حالانکہ ضرورت ہے کہ شاعر کی اندرونی کیفیتوں کا پتہ لگایا جائے جیسا وہ خود فرماتے ہیں کہ :—

برگ گل رنگین ز مضمون من است
مصرع من قطرهٔ خون من است

اس سلسلہ میں ذرا علامہ اقبال پر بھی تھوڑی سی نظر ڈال لیجئے - جس زمانہ میں اقبال نے شاعری شروع کی داغ و امیر کا طوطی بول رہا تھا - یہی دو اصحاب دھلی و لکھنؤ میں زبان دانی و فصاحت کی سند تسلیم کئے جاتے تھے - اقبال کو داغ سے تلمذ حاصل تھا جن کا اثر ان کے کلام پر صاف نمایاں ہے - اور امیر کے لئے تو وہ خود کہتے ہیں کہ :—

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال

میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبین میں نے

ان کے علاوہ میر انیس کے وہ بے حد مداح ہیں اور شکوہ اور جواب شکوہ کے زور کلام میں میر انیس کا رنگ صاف جھلکتا ہے - اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جہاں تک صورت کا تعلق ہے انہوں نے اپنے زمانہ کے فنی ترکہ سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے یعنی سامان فن و لوازم پیکر تراشی کے لحاظ سے ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری تو ضرور ہے مگر معنی کے لحاظ سے گل و بلبل کی روح سے بہت بلند ہے - یہ بلندی تقاضا ہے ان کے صاحب نظر ہونے کا جو گل و بلبل کے پیکر کے باوجود ان کو گل و بلبل کی روح سے بہت دور لے گیا - اس پرواز معنی میں ممکن ہے زبان کا پورا اہتمام نہ ہو مگر کلام کا اثر یقیناً بڑھ گیا ہے - علامہ اقبال خود فرماتے ہیں :—

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو

نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

اگر آپ کسی بڑے شاعر کا کلام دیکھیں گے تو آپکو معلوم ہوگا کہ ہر بڑا شاعر اپنے زمانہ تک کے سامان فن سے آگاہ ہوتا ہے ' ایک حد تک ان سے استفادہ حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد اپنے جذبات کے لحاظ سے الگ روش اختیار کرتا ہے - حافظ کے یہاں سلمان ساوجی ' خواجو اور سعدی کا کتنا اثر ہے - خود فرماتے ہیں :—

استاد غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما

دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

بعد کو پھر حافظ کا اپنا علیحدہ رنگ کھلتا ہے اور وہ اپنی ایک خاص روش اختیار کر لیتے ہیں -

اگر صاحب فن بڑا ہے تو وہ اپنے زمانہ کے فنی اصطلاحات کو جانتا ہے ' سمجھتا ہے اور انکو حسب ضرورت استعمال کرتا ہے لیکن اگر کہیں فن کے مسلمہ اصول کے خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ دانستہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا جوش طبیعت ' اس کا علوے تخیل اس کو زمین پیکر سے آسمان معنی کی طرف اُڑا کر لیجاتا ہے - اگر یہ پرواز نہ ہو تو سامان فن میں تغیر نہ آئے اور سامان فن کی ترقی رک جائے - علاوہ بریں یہ پرواز دلیل اس بات کی بھی ہے کہ جوئے زندگی نے ایک نئی راہ اپنی روانی کے لئے تلاش کرلی اور اس جدت سے نہ صرف اس شخص کی ذات کو بلکہ اس زمانہ کے تمام لوگوں کو فنی تقویت اور روحانی مسرت ہوتی ہے - جرمنی کے مشہور شاعر شلر کا قول ہے کہ شاعر کسی شہر کا شہری نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے زمانہ کا شہری ہوتا ہے - اس سے مراد یہی ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے زمانہ کو کچھ بخشتا بھی ہے -

(٦)

آرٹ اور اخلاق

آرٹ اور اخلاق کے درمیان مدتوں سے جنگ چلی آتی ہے - جب ہم فریقین پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فلسفی ' شاعر اور صاحبان فن کمریں کسے ہوئے باہم دست و گریبان ہیں - ایک گروہ کہتا ہے کہ فنون لطیفہ مثلاً شاعری ' بت تراشی ' مصوری وغیرہ کو آزادی صرف وہیں تک دینی چاہئے جہاں تک اخلاق اجازت دے لیکن جہاں فن تخریب اخلاق کے درپے ہوا وہیں اس سے سختی سے باز پرس کرنی چاہئے اور اس کو بہ جبر روک دینا چاہئے - یعنی اس گروہ کے مطابق آرٹ کو اخلاق کا تابع بن کر رہنا چاہئے اور ذرا سی سرکشی پر بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینی چاہئے - اس گروہ میں اہل مذاہب بھی

شامل ہیں - دوسرے گروہ کا دعویٰ ہے کہ فن لطیف ایک آزاد فن ہے - اسکی ترقی عین روح کی ترقی ہے اور اسکا انحطاط روح کا انحطاط ہے - یہ انسان کے اندرونی سوز و گداز کا دفتر ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے - یہ روح کا ایک نعرۂ مستانہ ، ایک کیف بیخودی اور آتش نفسی کا ماحصل ہے - یہ وہ بلند مقام ہے جہاں ارادہ کا دخل نہیں ، نیت کا گزر نہیں ، عقل کے پر جلتے ہیں - پھر ایسی چیز جو سراسر ارادہ کی محتاج اور عقل کی دست نگر ہو اخلاق کے زیر اثر کیسے رہ سکتی ہے - غرض دونوں طرف سے خوب معرکہ آرائیاں ہوتی چلی آئی ہیں - امتداد زمانہ کے ساتھہ اس معرکہ کے سپاہیوں کی حالت بھی بدلتی گئی - قرون وسطی میں گروہ اول کے اجارہ دار اہل مذاہب بن بیٹھے اور چونکہ وہ کلیسا کے مالک تھے اس لئے اُنہوں نے جیسا سکہ اپنی سلطنت میں چاہا چلایا - اٹھارھویں صدی کے آخر میں زمانہ نے پلٹا کھایا اور انقلاب فرانس رونما ہوا - عقلیت کی ترقی ہونے لگی اور اہل مذہب کا اثر کم ہوتا گیا - یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ان دونوں فریقوں میں ایک فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی جس میں اہل مذہب کو شکست ہوئی - اس کے بعد سے آرٹ کو اخلاق سے بر تر نہیں تو برابر ضرور سمجھا جانے لگا -

اگر آرٹ کا تعلق زندگی سے ہے اور اگر اخلاق کا مقصد زندگی کو سنوارنا ہے تو آرٹ اور اخلاق کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہوگا -

یونانیوں میں یہ خیال کہ حسن اور نیکی ایک ہی چیز ہے اتنا عام تھا کہ اُن کی روزمرہ زندگی کا جزو بن گیا تھا - ان کے لئے اخلاق اور جمالیات دو علیحدہ چیزیں نہیں تھیں - وہ نیک آدمی کو حسین اور حسین کو نیک کہتے تھے - یونان کا مشہور ڈرامہ نگار سفوکلیز زندگی کے

نشیب و فراز پر حکیمانہ نظر رکھتا تھا اس نے کتاب زندگی کی پوری ورق گردانی کی تھی - اس کے ڈراموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک یونانی شہری کی زندگی میں حسن اور اخلاق میں گہرا اتحاد تھا - سفوکلیز زندگی کے تمام مظاہر میں نیکی کو سب سے زیادہ حسین کہتا ہے - اسی طرح پلاٹینس جس نے یونانی تہذیب کے کاروان رفتہ کا بڑی دقت نظر کے ساتھ جائزہ لیا ہے ' کا قول ہے کہ حسن اور نیکی ایک ہی چیز ہے اور حسن قدرت اور حسن عمل میں کوئی فرق نہیں -

آسانی ہوگی اگر ہم اس بحث کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کردیں - پہلا حصہ تو اس سوال پر مبنی ہوگا کہ صاحب فن کے دل میں جو قدور اظہار سے قبل موجود ہیں انکا اظہار کے وقت اسکی طبیعت پر کیا اثر پڑتا ہے - یعنی صاحب فن کی طبیعت پر ان قدرون کا اخلاقی اثر کیا پڑتا ہے اور اس وقت صاحب فن کی طبیعت آیا مسرور و شادمان ہوتی ہے یا پھر کسی قسم کا تکدر اور بوجھ محسوس کرتی ہے - اگر ہم اس سوال کو دو چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دین تو جواب میں سہولت ہوگی - پہلا ٹکڑا اس سوال پر مشتمل ہوگا کہ کیا صاحب فن ایسی قدور کا اظہار کرسکتا ہے جس سے اس کی طبیعت مکدر ہو یا جو اسے ناگوار معلوم ہو - اگر یہ اظہار ممکن ہے تو کیسے ممکن ہے ؟ اس کا کوئی شافی جواب ناممکن ہے کیونکہ بیشتر صاحبان فن کی صنعتوں کو دیکھنے کے بعد براہ راست اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ تخلیق کے وقت صاحب فن کے جذبات پر کس شے کا کیسا اثر پڑتا ہے - ایک ہی چیز کو مختلف حضرات دیکھتے ہیں اور مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور مختلف قسم کی صنعتیں تیار کرتے ہیں - اس لئے کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ فلاں چیز کو

دیکھنے کے بعد فلاں قسم کا اثر ہوتا ہے - زیادہ سے زیادہ قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے - مثلاً ایک صاحب فن کسی چیز کی طرف عقلی یا غیر جمالیاتی نظر سے دیکھتا ہے تو ممکن ہے وہ چیز اسکو بھدی ' بد وضع اور ناگوار معلوم ہو اور اسکی طبیعت میں تکدر پیدا کردے لیکن اگر اسی وقت تخیل کا عمل شروع ہوگیا تو وہی چیز رفتہ رفتہ اپنی بد وضعی اور بدصورتی چھوڑ کر حسین ہوجائیگی اور پھر صاحب فن کی خواہش اظہار اس کے انقباض طبیعت کو کم اور اسکو اپنے مضمون سے قریب تر کردیگی - میر انیس کے مرثیوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ جب وہ اپنے تخیل سے کربلا کا نقشہ کھینچتے ہیں تو وہ بھیانک پن نظر نہیں آتا جس سے روح لرز اٹھے - وہاں گلاب کےپھول کھلتے ہیں اور چرخ اخضری پر آفتاب بھی نکلتا ہے تو گلاب کے پھول کی طرح کھلتا ہے - صبح کے منظر سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی انتہائی سنسان اور وحشت ناک جگہ ہے جہاں کوئی یار و غمگسار نہیں بلکہ مرغان چمن درختوں پر چہکتے ہیں ' ٹھنڈی ہوا چلتی ہے ' پھول مہکتے ہیں ' سبزہ لہکتا ہے اور جب شبنم روتی ہے تو سارا صحرائے کربلا زمرد کی زمین بن جاتا ہے جس پر موتیوں کا فرش بچھا ہوا ہے - کبھی دشت وغا خلد بریں کا نمونہ بنتا ہے اور کبھی دامن صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے - میں بالکل یہ نہ کہونگا کہ موقع تو یہ تھا کہ کربلا کے ذرہ ذرہ سے بھیانک پن ٹپکتا کیونکہ یہ تو صاحب فن کی اثر پذیری کی خاصیت پر ہے کہ وہ کیا اثر لیتا ہے - اتنا البتہ ماننا پڑیگا کہ شاعر کے دل پر کچھ اور ہی اثر ہے - یہ اثر کیسے ہوا اس کا پتہ چلنا ذرا مشکل ہے - لیکن اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی چیز دیکھکر صاحب فن کے دل پر نہایت وحشتناک اثر ہو اور اس اثر کا اظہار آرٹ میں صاف نمایاں ہو - مشہور روسی افسانہ نگار تالسٹائی کا

ایک افسانہ '' سیبسٹو پول '' ھے جس میں اس نے جنگ کریمیا کی لڑائیوں کا حال لکھا ھے - چوتھے مورچہ کی لڑائی تو خاص طور پر قابل ذکر ھے - میدان جنگ میں سپاھیوں کے سر اور اعضاء خزاں دیدہ پتوں کیطرح اس طور پر گرتے ھیں کہ دل ھل جاتا ھے اور کشت خوں کا بے پناہ منظر نظر کے سامنے پھرنے لگتا ھے - اور اس وحشت ناک اثر کے باوجود آپ اس منظر سے دلچسپی کا اظہار کرتے ھیں- اسی ضمن میں ابھی حال میں ایک جرمن مصنف کا جو مشہور افسانہ All Quiet on Western Front کے نام سے شائع ھوا ھے ذکر کے قابل ھے - اس میں بھی آگ اور خون کے کھیل کا جس بھیانک انداز کے ساتھ ذکر کیا گیا ھے اس سے جنگ کی ھیبت دل پر بیٹھ جاتی ھے - مگر آپ بار بار اسے پڑھتے ھیں - اور اس سے دلچسپی کا اظہار کرتے ھیں -

اس لحاظ سے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی خاص چیز کا کوئی خاص اثر کیا ھوگا - اثر کی خاصیت کا دار و مدار تو سراسر صاحب فن کی شخصیت پر ھے - ھاں اگر تخیل سے مدد لیکر قیاس آرائی کی جائے تو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ھوگا کہ یہ اظہار کیوں ھوتا ھے - بات یہ ھے کہ ایک چیز سے طبیعت میں تکدر پیدا ھوسکتا ھے مگر ساتھ ھی ساتھ طبیعت اس سے دلچسپی کا اظہار بھی کرسکتی ھے اور اس کی طرف راغب ھوسکتی ھے - یہ دلچسپی کئی صورتوں میں ظاھر ھوتی ھے - مثلاً کسی شے سے آپ کو نفرت ھے - اس نفرت کی بنا پر آپ اس سے علیحدہ تو ھیں مگر بے تعلق نہیں کیونکہ اس شے کا خیال آپ کے ذھن میں موجود ھے اور ایک طرح کی دلچسپی ھے - اس کو مرزا غالب نے ایک لطیف طریقہ سے ادا کیا ھے :—

قطع کیجئے نہ تعلق ھم سے
کچھ نہیں ھے تو عداوت ھی سہی

عداوت ہے مگر بے خبری نہیں اور کم سے کم دلچسپی کا یہ اظہار بہت کافی ہے - اسی طرح ایک چیز جو بظاہر خراب اور مہلک ہے اس سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے - جیسے ڈاکٹر مہلک بیماریوں سے تجربہ کی خاطر دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تاکہ ان کی حقیقت اور ان کے خواص سے آگاہی ہو - پھر اسی طرح کتنے لوگ اپنی بعض خواہشات کو پورا کرنے کے لئے جس میں نقصان کا اندیشہ ہو کتنی ناجائز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان سے لطف اٹھاتے ہیں - یا پھر نفسی ارتقاء کے ابتدائی دور میں طبیعت سنسنی پھیلانے والی چیزوں کی طرف راغب ہوتی ہے خواہ ان سے تکلیف ہی کیوں نہ ہو - آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کہیں کوئی ہنگامہ ہوجائے اور گولی چلتی ہو اور لوگونکی جانیں جا رہی ہوں پھر بھی خلقت اس خطرہ کے باوجود ٹوٹی پڑتی ہے - اس بھیڑ بھاڑ میں بیشتر نوجوان ہوتے ہیں جنکی امنگ ہرآن ایک نئی سرگرمی کی متلاشی اور ایک نئے جوش کا سامان ڈھونڈھتی رہتی ہے - اسی سرگرمی اور جوش میں ضرر کے اندیشہ سے بے پروا ان کی اندرونی خواہش کو جو اضطراب کی دلدادہ ہے سکوں ملتا ہے اور ایک طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے - مندرجہ بالا مثالوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز خواہ وہ کتنی ناگوار اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو مگر جب اس سے دلچسپی ہوجاتی ہے تو اس دلچسپی میں بھی ایک طرح کا لطف ملتا ہے اور جب لطف ملتا ہے تو اس کا اظہار مثل دوسری چیزوں کے بھی آرٹ میں ہونا ممکن ہے -

دوسرا ٹکڑا اس سوال پر مشتمل ہے کہ خود صاحب فن کی اخلاقی زندگی کا اثر اس کے احساس جمال پر کیا پڑتا ہے ؟ یعنی اسکی روزمرہ زندگی جو بظاہر آرٹ سے الگ ہے اس کے احساس جمال پر کیسا اثر ڈالتی ہے - اس سوال کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے یعنی خود

صاحب فن کے اخلاق و کردار کا مطالعہ کیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ اس کی زندگی کا اثر اس کے فن پر کیا پڑتا ہے یا پھر ہم ایک عام قیاس کی بنا پر یہ رائے قائم کرلیں کہ چونکہ صاحب فن کا آرٹ فلاں قسم کا ہے اس لئے صاحب فن کی اخلاقی زندگی بھی کم و بیش اسی طرح کی ہوگی - اگر اول الذکر طریقہ اختیار کیا جائے تو بڑی دقت اخلاق کی تعریف میں ہوگی - پھر صاحب فن کی زندگی کے صحیح صحیح واقعات کا ملنا اور ان کو صحیح صحیح سمجھنا بڑا مشکل ہوگا - ان مشکلات کیوجہ سے عام طور پر یہ مشہور ہوگیا ہے کہ صاحبان فن کا پایہ اخلاق سے گرا ہوتا ہے - اگرچہ وہ بد نہ ہو مگر بدنام تو ضرور ہوتے ہیں - وہ رسوم کی پابندیوں سے بیفکر اور قیود کی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہیں - اسکی وجہ خواہ کچھ ہی ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ صاحب فن کی زندگی فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ وہ ایک حساس دل اور نازک تخیل رکھتا ہے اس واسطے ذرا سے صدمہ کی بھی تاب نہیں لاسکتا اور ایک معمولی سی ٹھیس سے اس کا توازن طبع بگڑ جاتا ہے - پھر وہ جوشیلا ہوتا ہے اور جوش میں بعض وقت ایسی جلد بازی سے کام لیتا ہے اور نازیبا حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ اگر تھوڑی دیر سوچتا تو شاید کبھی نہ کرتا - تخیل کی اس نزاکت اور طبیعت کی اس امنگ اور جوش سے اس کے دماغی فعل پر اثر پڑتا ہے جس سے اکثر اسکی شہوانی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے - اس سے اکثر لوگ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں اور اسکو ایک طرح کی سند بھی قرار دیدی ہے کہ صاحب فن کو رسوم و قیود سے آزاد ہونا چاہئے - یہ نتیجہ جتنا مبالغہ آمیز ہے اتنا ہی مضحکہ خیز بھی ہے کیونکہ اس بیان کے مطابق اخلاق کی تعریف میں بہت کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - اجارہ داران اخلاق جب اخلاق کا ذکر

کرتے ہیں تو سیرت کی اور بہت سی اچھائیوں اور برائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف شہوانی زندگی کا اصول ان کے سامنے ہوتا ہے گویا ہماری اخلاقی زندگی کا بس یہی ایک پیمانہ ہے - یہ دائرہ اتنا تنگ ہوجاتا ہے کہ انسانی سیرت کے کتنے پہلو خواہ کتنے ہی تاریک کیوں نہ ہوں اس سے علیحدہ کردئے جاتے ہیں - اگر کوئی جھوٹ بولے ' ناجائز طریقہ پر دوسروں کی دولت ہضم کرے ' رشوت لے یا وظیفۂ 'دست غیب' کا عامل ہو ' دوسروں کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرلے ' خلق اللہ کو طرح طرح سے پریشان کرے تو یہ محض گناہ ہوگا مگر شاید بد اخلاقی میں شمار نہ ہو - ان لوگوں کے مطابق اخلاق تو اسی شخص کے خراب کہے جائیں گے جو اپنی جنسی زندگی میں رسم و رواج کے مطابق احتیاط نہیں برتتا - اس میں شک نہیں کہ جنسی زندگی شخصی و نیز سماجی زندگی کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اہمیت ضرور رکھتی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کسی شخص کی اخلاقی زندگی کا جائزہ لیتے وقت اس کی سیرت کے دوسرے پہلوؤں کو بھول جائیں اور صرف ایک ہی پیمانہ سامنے رکھیں - ایک گوشہ سے کل پر رائے قائم کرنا کہاں کا انصاف ہوگا - اس لحاظ سے اگر ہم کسی کی اچھائیوں پر نظر ڈالیں تو ہمکو دیکھنا چاہئے کہ اس میں شرافت نفس ' خود داری ' بلند ہمتی ' ہمدردی ' صداقت ' خلوص ' رواداری اور ایثار وغیرہ کہاں تک ہیں اور جب برائیوں کا جائزہ لیں تو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ برائیوں میں بغض ' کینہ ' جھوٹ ' دغابازی ' مکاری ' خود غرضی ' پست ہمتی ' تنگ نظری وغیرہ بھی شامل ہیں - اگر ہم کسی صاحب فن کی سیرت کا مجموعی طور پر مشاہدہ کریں تو وہ شاید اتنا برا نظر نہ آئے جتنا کہ پہلے نظر آتا تھا - اگر اخلاق کا یہ وسیع مفہوم لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی شخص کی سیرت کا جائزہ لینا کتنا مشکل ہے اور اگر کہیں

وہ شخص ہم سے دور ہے یا مرچکا ہے یا ہم تک اس کے متعلق جو اطلاعات پہونچی ہیں اُن کا دار و مدار محض روایتوں یا کتابوں پر ہے تو اس صورت میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا اور بھی مشکل ہوجائیگا -

• اچھا اگر ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں اور صاحب فن کے آرٹ سے اس کی اخلاقی زندگی کا حال معلوم کرنا چاہیں تو یہاں بھی ہم کو قیاس سے کام لینا پڑیگا اور ظاہر ہے کہ اس میں حزم و احتیاط کی کتنی ضرورت ہوگی کیونکہ اکثر شراب و ساقی ' رندی ومستی ' رقیب و نامہ بر کے پردوں میں صاحب فن اپنی اخلاقی زندگی چھپا لیتا ہے - عمر خیام کا کلام دیکھ کر بہتوں کو دھوکا ہوا کہ خیام ایک بے فکر ' شاہد پرست اور رند مشرب شخص تھا جو ہر وقت بدمست رہتا اور جس کو سوائے شغل بادہ و ساغر کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا - مگر مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر سے خیام کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چیزیں محض لازمۂ سخن تھیں جو صرف تشبیہ و استعارہ کی غرض سے استعمال کی گئیں ہیں ورنہ اپنی اخلاقی زندگی میں وہ ایک اعلیٰ اصول کا پیرو تھا -

جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں ہر صنعت عظیم میں زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور حقیقت اس پر اپنا سایہ ڈالتی ہے - اس لحاظ سے وہ لمحہ جس میں صاحب فن پر ان بلند قدور کا انکشاف ہوتا ہے یقیناً ان لمحوں سے برتر اور زیادہ بزرگ ہے جن میں صرف معمولی معمولی چیزیں معلوم ہوتی ہیں - اگر آرٹ کا مقصد فکر و نظر کی مدد سے زندگی کو ایک روحانی بلندی پر لیجانا ہے اور اگر اخلاق کا مقصد بھی یہی ہے کہ عمل سے روح کو بلند کیا جائے تو پھر اخلاق اور آرٹ یقیناً

ایک دوسرے کے معاون ہوں گے اور ان دونوں میں کوئی تصادم ناممکن ہوگا فن میں ایک بلند روحانی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور اس عکس کو پیدا کرنے کے لئے صاحب فن اپنی تمام انسانی صلاحیتوں کو جن میں اخلاقی صلاحیتیں بھی شامل ہوتی ہیں حتی الوسع بروے کار لاتا ہے۔ اس لئے بغیر بلند اخلاقی نظر کے فن بھی بلندی پر نہیں پہونچ سکتا - کسی شخص کی شاعری اگر اپنے اندر عظمت رکھتی ہے تو اس میں بلند اخلاقی نظر کا پایا جانا ضروری ہے - اس لحاظ سے تنقید کے وقت ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ شاعری کا جو آئینہ اس نے تیار کیا ہے اس میں زندگی کا عکس کیسا نظر آتا ہے ؛ پھر یہ عکس جزوی ہے یا کلی ہے - اگر صاف ہے اور کل کا ہے تو یقیناً فن میں عظمت ہے اور شاعر ایک بلند پایہ شاعر ہے - اور اس میں بلند اخلاقی نقطہ نظر بھی ضرور موجود ہوگا -

شاعری اور پیغمبری

لیکن صاحب فن یا شاعر میں بلند اخلاقی نقطہ نظر پائے جانے کے یہ معنی نہیں کہ اس کا شمار ان معلمین اخلاق میں ہے جو پیغمبر کے نام سے ملقب ہیں اور جنکی زندگی انسانوں کے اخلاق درست کرنے پر وقف ہوئی ہے جو خود سراسر اخلاق کا مجسمہ تھے اور جن سے اہل زمانہ درس اخلاق و پاکیزگی لیتے رہے ہیں - یہ وہ بلند مرتبہ ہے جہاں انتہائی بلندی نظر کے ساتھ انتہائی ذوق عمل بھی ہوتا ہے اور یہ صفت پیغمبری ہے - البتہ صاحب فن کے یہاں اخلاق ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے فن میں اخلاقی قدور کا اظہار کرتا ہے مثلاً جب کسی افسانہ یا ڈرامہ میں کوئی ظالم بادشاہ اپنے تاج و تخت سے محروم ہوکر ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتا ہے تو ہم خوش ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہونچ گیا - تنقید کا یہ معیار بالکل اخلاقی ہے

کیونکہ ظلم کی سزا بھی تھی کہ ایک ظالم کو سخت، سے سخت خمیازہ برداشت کرنا پڑے -

شاعر اور پیغمبر میں ہم رنگی ہوتی ہے اور فرق بھی - ہم رنگی کی مثال تو یہ ہے کہ شاعر کا اخلاقی نقطہ نظر بھی اُسی خزانہ سے عطا ہوتا ہے جہاں سے پیغمبر کو پیغمبری ملتی ہے - دونوں اعلیٰ درجہ کے صاحب نظر ہوتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں - اسی لئے کہا گیا ہے شاعری جزویست از پیغمبری یعنی جہاں تک نظر کا تعلق ہے شاعری پیغمبری کا ایک جزو ہے اور بس - مگر پیغمبری کا درجہ شاعری سے اس واسطے بلند ہے کہ پیغمبر میں کمال بالغ نظری کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا ذوق عمل بھی ہوتا ہے مگر شاعر کے اعمال و اقوال میں بڑا فرق ہوتا ہے - شاعر کی زندگی محض فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے - وہ مرغ قبلہ نما کی طرح تڑپتا ہے اور احساس رکھتا ہے مگر دل میں نہ تو وہ ذوق عمل اور نہ قدم میں وہ روانی ہوتی جو پیغمبر میں ہوتی ہے - بحیثیت شاعر کے اس سے عمل کی خواہش رکھنا اس کو اپنے حلقہ سے باہر نکلنے کی دعوت دینا ہے - لیکن اگر کسی شخص کی زندگی میں یہ دونوں خصوصیتیں خواہ کسی حد تک بھی سہی جمع ہوجائیں تو سمجھنا چاہئے کہ اس پر پیغمبری کا عکس پڑ رہا ہے -

اس لحاظ سے ہم شاعر یا صاحب فن سے کسی عمل کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں تخیل کے ساتھ ساتھ ہمدردی، رواداری، محبت، اخلاق، وسیع النظری، لوگوں کو سمجھنے کی خواہش، اور اجزا کو ایک کل کی صورت میں ترتیب دینے کی تمنا ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں تک ہے کیونکہ یہی چیزیں ہیں جنکو آرٹ

کی ضرورت ہوتی ہے اگر صاحب فن کی روزمرہ زندگی ان چیزوں سے خالی ہے تو بھلا اس کے آرٹ میں یہ چیزیں کہاں سے آئیں گی کیونکہ ان صلاحیتوں کی کمی اس کے آرٹ پر خراب اثر ڈالے گی - لیکن اگر یہ صفات اس کی اخلاقی زندگی کا جزو ہیں تو یقیناً اس کے فن پر اچھا اثر پڑیگا - اعمال صالح سے نظر صالح اور بلند ہوتی ہے - مولانا روم فرماتے ہیں :—

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

صالح سے مراد یہی بلندی نظر ہے یعنی نیکوں کی صحبت سے تخیل بلند ہوتا ہے اور انسان و کائنات سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس سے روح کو سرور ملتا ہے - اور طالح سے مراد مندرجہ بالا صفات کا فقدان ہے -

ایک صاحب فن جس کی اخلاقی زندگی بلند نہیں ہے ممکن ہے ایک اچھا دستکار ہوجائے مگر اعلیٰ درجہ کا صاحب فن نہیں ہوسکتا - اس میں ممکن ہے تھوڑی بہت تخیل کی صلاحیت ہو اور کسی حد تک جذبات بھی ہوں مگر اس میں تناسب کا فقدان ضرور ہوگا کیونکہ وہ کسی چیز کو کل کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکیگا اور کل کی عظمت اس کے ذہن میں نہیں آئے گی اس لئے وہ آرٹ کا رابطہ اخلاق کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا کیونکہ جہاں انسان کی روحانی بلندی اور کائنات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جاتا ہے وہاں آرٹ اور اخلاق جاکر مل جاتے ہیں اور یہ بلندی اس کے پست تخیل سے بہت دور ہے - تخیل کی یہ بلندی جہاں آرٹ اخلاق کا معاون ہوتا ہے حاصل کرنا آسان نہیں - مدتوں کی تربیت اور مدتوں کی پرورش

کے بعد یہ جوہر پختہ ہوتا ہے - صاحب فن کو اپنی روح کا راز فاش کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے :—

قرنہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب

لعل گردد در بدخشان یا عقیق اندر یمن

اول صاحب فن کو کمال غور و فکر سے اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لینا پڑیگا ، اپنی فطرت کو پرکھنا پڑیگا اور پھر سالہا سال کی محنت و مشقت اٹھانی پڑیگی تب کہیں اس کو دیدہ بینا عطا ہوسکتا ہے اور وہ اس کائنات کا راز دار بن سکتا ہے -

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گو محنت و مشقت اس سفر کا ایک ضروری زاد راہ ہے مگر منزل تک پہونچنا اس کا لازمی نتیجہ نہیں کیونکہ :—

این دولت سرمد ہمہ کس رانہ دہند

لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہر صاحب فن بزرگ ہی ہو اور اسکی نگاہ کہکشاں تک پہونچے - زندگی کی اور بھی تو معمولی معمولی حقیقتیں ہیں جن کا جاننا ضروری ہے - اگر گلاب خوبصورتی کے ساتھ خوشبو بھی رکھتا ہے تو لالۂ صحرائی میں بھی ایک شان دلفریبی اور دلاویزی پائی جاتی ہے - اگر میدان نہ ہوں تو پہاڑ کی عظمت کا اندازہ کیسے ہوگا - اگر تالاب نہ ہوں تو سمندر کی وسعت کس کے خیال میں آسکتی ہے - اگر چھوٹی حقیقتوں کا حال نہ معلوم ہو تو بلند حقیقت کا خیال کیسے ذہن میں آئیگا - اس لئے معمولی درجہ کا صاحب فن بھی اعلی درجہ کے فن کے سمجھنے اور اس کی ترقی میں خاصی مدد کرتا ہے -

منجملہ اور اخلاقی صفات کے صاحب فن میں اخلاص کا ہونا ضروری

آرٹ اور اخلاص

بلکہ اشد ضروری ہے - اس سے دو طرح کا اخلاص مراد ہے ایک تو اخلاقی اخلاص اور دوسرا فنی اخلاص - اخلاقی اخلاص سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی کو جان بوجھ کر دھوکا نہ دیا جائے یعنی قول و فعل میں ہم آھنگی ہو اور ضمیر ریا کاری کی آلائش سے پاک ہو - لیکن اگر کسی شخص کی روزمرہ زندگی اس قسم کی ہے کہ وہ لوگوں کو فریب دیتا ہے ' اور جعل سازی کرتا ہے اور وہ صاحب فن بھی ہے تو اُس کے فن پر اس عادت کا مثل دوسری اخلاقی خرابیوں کے ناگوار اثر پڑنا لازمی ہے -

لیکن فن میں جس چیز کی اشد ضرورت ہے اور جس کے بغیر کوئی فن فن نہیں ہوسکتا وہ صاحب فن کا خود اپنی ذات سے ایک رشتۂ اخلاص قائم کرنا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو صرف انہیں چیزوں کا اظہار کرنا چاہئے جن کا اس کے دل پر اثر ہوتا ہے - بقول مرزا کے :—

ع تب ناز گراں مائگی اشک بجا ہے

جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

یعنی اس اظہار میں اس کو انتہائی خلوص و صداقت سے کام لینا چاہئے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے وہی زبان پر ہونا چاہئے - ایسا نہ ہو کہ آج کچھ کہا اور کل اس کا بالکل مخالف - واضح رہے کہ صاحب فن کی طبیعت میں نشو و نما ہوتی ہے مگر تضاد و تخالف نہیں ہوسکتا - یہ ممکن ہے کہ جو چیز آج چھوٹی ہے کل بڑھکر بہت بڑی ہوجائے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ سرے سے غائب ہوجائے اور دوسری بالکل مخالف چیز اس کی جگہہ لیلے - اگر صاحب فن خود اپنی ذات سے اخلاص نہیں برتتا ' ریاکار ہے اور دل میں کچھ اور رکھتا ہے اور زبان سے کچھ

اور کھتا ہے تو نہ صرف اس کی اخلاقی زندگی خراب ہوگی بلکہ اس کی صنعت بھی بالکل بد صورت اور خستہ حال ہوگی - جو صاحب فن اس قسم کے زہریلے اثر میں مبتلا ہے وہ نہ صرف بحیثیت انسان کے بلکہ بحیثیت صاحب فن کے بھی محض ایک دھوکا ہے ' ایک فریب ہے اور سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس ریاکاری کی بین مثال اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب صاحب فن کسی غیر جمالیاتی خیال سے متاثر ہوکر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور فن کو ایک آلۂ کار بناتا ہے مثلاً نام و نمود کی خواہش ' شہرت کی آرزو ' روپیہ پیدا کرنے کے شوق کو فن کی مدد پہونچاتا ہے یعنی فن کو کسی غیر جمالیاتی مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتا ہے - اس صورت میں اس کا فن نہ صرف ناقص ' خام اور بے روح ہوجاتا ہے بلکہ اس کے احساس جمال میں بھی فرق پڑ جاتا ہے ظاہر ہے کہ فن کے مذہب میں اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں - لیکن یہ بھی اکثر دیکھا گیا کہ اخلاص کے باوجود صنعت اچھی نہیں ہوتی - اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ صاحب فن اصطلاحات کی مشق میں یا تو کچا ہے ' کافی محنت نہیں کرتا : تخیل میں جوش پیہم نہیں دکھاتا یا پھر اتنا بلند ہے کہ اصطلاحات اس کے تخیل کا پورے طور پر بار نہیں اٹھا سکتے -

اچھا اب اس بحث کا دوسرا بڑا حصہ لیجئے یعنی اظہار سے قبل صاحب فن کے دماغ میں جو قدور ہیں اور جو متشکل ہونے والی ہیں ان کا اس کی صنعت پر کیا اثر پڑتا ہے اس سوال کو بھی اگر دو ٹکڑوں میں توڑ دیں تو جواب آسان ہوگا پہلے تو یہ دیکھنا پڑیگا کہ جو قدور طبیعت پر اچھا یا ناگوار اثر ڈالتی ہیں ان کا صنعت پر کیا اثر پڑتا ہے - پھر یہ دیکھنا پڑیگا

کہ اخلاق کے لحاظ سے قدرو کے روشن و تاریک پہلوؤں کا صنعت پر کیا اثر پڑتا ہے - یہ دونوں ٹکڑے گو الگ کردئیے گئے ہیں مگر درحقیقت الگ نہیں کیونکہ جو چیز اخلاق سے گری ہوئی ہے وہ ناگوار اثر پیدا کرسکتی ہے اور جو چیز ناگوار ہے وہ مخرب اخلاق کہی جاسکتی ہے - اسی طرح جو چیز اچھا اثر ڈالتی ہے اس کا شمار پسندیدہ اخلاق میں ہوسکتا ہے اور جو چیز اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہے وہ اچھا اثر ڈال سکتی ہے - لیکن مناسب یہی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو الگ ہی رکھا جائے تاکہ نفس مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے - یہاں ایک ضروری ضمنی سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا آرٹ کے لئے اخلاقاً اچھا یا خراب ' پسندیدہ ' اور ناگوار الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب کسی چیز کا آرٹ میں اظہار ہوتا ہے تو ان الفاظ کا استعمال اس جگہ غریب اور بے محل نہیں ہوتا اس واسطے کہ کسي ناگوار یا بد اخلاق چیز کا جب آرٹ میں اظہار ہوتا ہے تو اظہار اس کو دل خوش کن بنا دیتا ہے اور اور ان سے وہ نفض اور تخریبی کیفیت نظر انداز ہوجاتی ہے - اس میں شک نہیں کہ صاحب فن کو کسي چیز کے اظہار سے خواہ وہ کچھ ہي ہو مسرت ضرور ہوتي ہے مگر کیا اس اظہار میں چیزوں کي قلب ماہیت ہو جاتی ہے ؟ کیا کسي شے کے ناگوار یا پسندیدہ عمدہ یا مخرب پہلو غائب ہوجاتے ہیں ؟ میری رائے میں تو کبھی یہ پہلو غائب نہیں ہوتے - بلکہ دوسرے پہلوؤں کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں - اچھا پہلے اخلاقی پہلو کو لیجئے - کسی صنعت کي تنقید ہمیشہ اخلاق کی کسوٹي پر ہوتي ہے - جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرد کا سوسائٹي سے کیا تعلق ہے اسي طرح آرٹ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جزو کا دوسرے جزو سے اور پھر کل سے کیا تعلق ہے - پھر یہ بھي دیکھتے ہیں کہ جو

فرض کسی جزو کے ذمہ ڈالا گیا ہے آیا وہ اسکو اچھی طرح ادا کرتا ہے - تنقید کا یہ پیمانہ آخر اخلاقی ہی تو ہے لیکن ہماری روزمرہ زندگی کے لئے جو اخلاقی پیمانہ ہوتا ہے اس میں اور آرٹ کے جانچنے کے لئے جو اخلاقی پیمانہ ہوتا ہے اس میں ذرا فرق ہوتا ہے - اخلاق کا کام ہماری روزمرہ زندگی کو درست کرنا اور سنوارنا ہے اور ایسے اصول وضع کرنا ہے جس سے افراد اور جماعت میں تصادم نہ ہو - ظاہر ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عملی پہلو کا بہت کچھ جائزہ لینا پڑتا ہے' لوگوں کی کمزوریوں پر نظر ہوتی ہے اور سوسائیٹی کو اخلاقی حیثیت سے بلند کرنے کا خیال ہوتا ہے لیکن فن کی دنیا خود ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے فن پر ہم اخلاقی نقطۂ نظر سے جو تنقید کرتے ہیں اسمیں صرف جمالیاتی پہلو نمایاں ہوتا ہے- آپ میر انیس کے مراثی پڑھتے ہیں تو آپکو مختلف اشخاص کے مختلف کردار نظر آتے ہیں - کوئی شخص جاں نثاری میں فرد ہے ' کوئی بہادری میں یکتا ہے ' کوئی محبت و غمگساری میں بے مثل ہے کوئی حقگوئی میں بے نظیر ہے - سیرت کے ان پہلوؤں پر جب آپ غور کرتے ہیں اور ان کو بے مثل اور یکتا کہتے ہیں تو آپ انہیں آخر اخلاق ہی کی نگاہ سے تو دیکھتے ہیں - اسی طرح آپ اگر ایک ڈرامہ دیکھ رہے ہوں جس میں کسی شخص کے ساتھ ظلم یا زیادتی کی گئی ہو تو آپ کا دل کڑھتا ہے ' آپکو تکلیف ہوتی ہے ' آپ غیظ میں آجاتے ہیں اور آپکے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں - کیوں ؟ اس لئے کہ ظلم عمدہ اخلاق کے خلاف ہے - لیکن اسکے باوجود وہاں آپکا جذبہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی آپ اس ظلم کی تلافی چاہتے تو ہیں مگر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ڈرامہ کے اندر ہی ظالم کو سزا مل جائے - یہ تو نہیں ہوتا کہ ظلم تو ہو ڈرامہ کے اندر اور آپ اسکی عملی تلافی کرنے لگیں کیونکہ وہاں مقصد تو صرف روحانی اور اخلاقی احساس ہے اخلاقی عمل نہیں - وہاں اخلاقی نقطۂ نگاہ

سے مراد صرف قدروں کی جانچ اور سیرت کی تشریح ہے - مگر یہ جانچ اخلاقی زندگی کے نصب‌العین کو سامنے رکھکر کی جاتي ہے یعنی آپ عمدہ سے عمدہ اخلاق کی روشنی میں سیرت کی تنقید کرتے ہیں - اس لئے ڈرامہ میں جب آپ کسی کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں انسانیت و شرافت کا جوہر کہاں تک ہے - آیا وہ اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرتا ہے یا مردانہ وار انکا مقابلہ کرتا ہے - پھر اگر ظلم کو شکست ہوتي ہے اور بدی کا بیڑا غرق ہوتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں کہ یہ چیزیں اپنے کیفر کردار کو پہونچ گئیں - اس لحاظ سے آرٹ میں اخلاقي زاویہ نگاہ تو ہوتا ہے مگر اخلاقي عمل نہیں ہوتا -

آرٹ میں یہ اخلاقی زاویہ نگاہ جیسا ہم بتا چکے ہیں عمدہ اخلاق سے مترتب ہوتا ہے یعنی ہماري اخلاقی زندگی کے بلند ترین نصب‌العین کا عکس آرٹ پر پڑتا ہے - لیکن اخلاقي زندگی کے عملي پہلوؤں کی تکمیل اُسی وقت ہوتي ہے جب انسان ان پہلوؤں کے منشا کے متعلق غور کرے اور نفس پر ان کے اثر کو سمجھنے کی کوشش کرے کیونکہ صحیح اخلاقی زندگی وہی ہوتی ہے جس میں نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی ہوتی ہے - اگر عمل کے نظری پہلوؤں سے نگاہ آشنا نہیں تو عمل بے روح ہوگا - اس لئے جب ہم کسی چیز کے نظری پہلو پر زور دیتے ہیں یعنی اس کو صرف تخیل اور تصور کی نظر سے دیکھتے ہیں تو وہ چیز فن میں داخل ہو جاتی ہے اور جب سوسائٹی کي بہتری کے لحاظ سے اس کے عملی پہلو پر نگاہ ہوتی ہے تو اس کا شمار اخلاق میں ہوتا ہے - اس طرح فن کی حیثیت سے جب کوئی چیز پیش کی جاتي ہے تو اس کا مقصد عمل کرنا یا عمل کی تلقین کرنا نہیں ہوتا بلکہ تصور و تخیل کے لئے صرف اخلاقی نقطۂ نگاہ پیش کرنا ہوتا ہے -

جس طرح آرٹ پر عمدہ اخلاقی قدور کا اثر پڑتا ھے اسی طرح نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کا بھی اثر پڑتا ھے - آرٹ میں ان نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کی حیثیت ہماری روز مرہ زندگی سے مختلف ہوتی ھے مثلاً اگر ہم کسی کو کوئی اخلاقی جرم کرتے دیکھتے ھیں تو اس کو روکنے کی کوشش کرتے ھیں اور اس کوشش کے لئے عملی قدم بڑھاتے ھیں مگر آرٹ کی دنیا میں ہم کو اس جرم کے صرف خراب ہونے کا احساس ہوتا ھے-ہماری طبیعت میں اس سے انقباض و تکدر کی کیفیت پیدا ہوتی ھے اور ہم صرف یہ چاہتے ھیں کہ ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور اگر ہوگیا تو آرٹ ھی میں اس جرم کی سزا بھی دیجائے - بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ھے کہ اگر صنعت میں ان نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدور کا ظہور ہوتا ھے تو کیونکر ہوتا ھے؟ اگر آپ کسی ایسی قدر کا جس سے طبیعت میں انقباض پیدا ہو آرٹ میں محض اس قدر کی غرض سے اظہار کریں تو یہ قدر بے کیف ہوگی - کسی تکلیف یا غم کا حال صرف غم کے لحاظ سے کون سنے گا اگر آرام و مسرت کا خیال ساتھ ساتھ نہ ہو - نا پسندیدہ قدور تو ہم صرف اس لئے پیش کرتے ھیں تاکہ پسندیدہ قدور کی اہمیت واضح ہوجائے - اگر آرٹ میں بد اخلاقی کا ذکر محض بد اخلاقی کی غرض سے کیا جائے تو وہ کوئی بڑا آرٹ نہ ہوگا کیونکہ خالص منفی قدروں کا ذکر جب تک ان کا سلسلہ اثبات والی قدروں کے ساتھ نہ ہو بے پشت اور بے نتیجہ ہوگا - بد اخلاقی کی اہمیت اگر ھے تو بس اتنی ھے کہ وہ نیکی کے رخ کو اور واضح کردے - ظلم ' جبر ' دغا بازی ' ہوس رانی وغیرہ کا ذکر اگر آرٹ میں آتا ھے تو لا محالہ کسی بلند اخلاقی صفت کو واضح کرنے کے لئے آتا ھے ورنہ بذاتہ یہ چیزیں خوشنما نہیں معلوم ہوتیں انسانی صفات کی ترقی کے لئے جس طرح نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا

لازمی ھے اسي طرح فن کی دنیا میں نا پسندیدہ اور مخرب اخلاق قدروں کا اظہار ضروري ھے - پھول کے ساتھ کانٹا نہ ھو تو پھول مکمل پھول نہ ھوگا اور کانٹے کي حیثیت یہاں محض کانٹے کي نہیں ھے بلکہ پھول کی دیدہ زیبي اور خوبصورتی کو بلند کرتی ھے - مرزا نے کیا خوب کہا ھے :—

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتي
چمن زنگار ھے آئینۂ بـــاد بہـــاری کا

گوئٹے نے اپنے مشہور ڈرامہ فاوسٹ میں شیطان کی بھي یہی حیثیت رکھی ھے یعني شیطان انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے ایک ناگزیر شے ھے اور بغیر اس شے پر کامرانی حاصل کئے ھوئے انسان اخلاقی کمال نہیں حاصل کرسکتا - میر انیس نے اپنے مراثی میں یزیدي افواج کا حال ان کی شقاوت ' انکي بے رحمی ' انکي جاہ پسندی و دنیاداری کا ذکر بڑے جوش سے کیا ھے مگر اس جوش بیان سے مقصد محض ان ناپسندیدہ چیزوں کا اظہار نہیں ھے بلکہ ان میں رنگ اس لئے بھرا گیا ھے تا کہ جو چیز مقابل میں پیش کی گئی ھے وہ اچھی طرح صاف اور روشن ھو جائے - مثلاً یزیدی فوج کے ایک سپاھي کا حال سنئے :—

بالا قد ' و کرخت و تنو مند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آھني کمر
ناوک پیام مرگ کے ' ترکش اجل کا گھر
تیغیں ھزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی ' طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقي کہ ھوا پر پہاڑ تھا
ساتھ اس کے اور اسی قد و قامت کا ایک پیل
آنکھیں کبود ' رنگ سیہ ابرؤں پہ بل

بدکار و بد شعار و ستمگار پر دغل
جنگ آزما ' بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لئے کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ حرب گرز پہ ' بہ تیغ تیز پر

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں :—

نکلا ادھر سے بہر وغا ایک رو سیاہ
زور آور و تہمتن و مغرور و کینہ خواہ
کاندھے پہ گرز ' بر میں زرہ ' خشمگیں نگاہ
سر پر مثال قبضۂ تیغ آہنی کلاہ
آمد شقی کی تھی کہ رواں رود نیل تھا
ہیبت میں تھا جو دیو تو ہیکل میں پیل تھا

پھر عابد بیمار کا حال ' گرمی کی شدت' پیاس کی تکلیف' بیکسی و بے سر و سامانی کی داستان غرض کتنے ہی نا پسندید مضامین ہیں جو کئی رنگ سے باندھے گئے ہیں - یہ صرف اس لئے ہے کہ قافلۂ اہل بیت کی جواں مردی ' قوت برداشت ' خدا کی راہ میں سرکٹانے کی تمنا یعنی ان کی سیرت کے مختلف پہلو روشن اور واضح ہو جائیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن میں کسی نا پسندیدہ چیز کا ذکر محض اس چیز کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر دوسری اچھی قدروں پر پڑتا ہے - اور اگر دوسری اچھی قدروں پر اسکا اثرنہ پڑے تو وہ نا پسندیدہ قدر بالکل بے کیف اور بیکار ہو جائیگی - اس لئے فن میں ناپسندیدہ اور مخرب اخلاق چیزوں کا ذکر آنا ممکن ہے مگر انکی ایک حیثیت ہوتی ہے جو مخرب اخلاق نہیں ہوتی لیکن اگر یہی چیز اخلاق کے دامن پر دھبہ لگانے کی شہ دے اور بہیمانہ خواہشوں کو بے مہار کردے

تو وہ فن فن نہ ہوگا - اس لحاظ سے فن اور اخلاق میں ایک گہرا رشتہ ہے
جس کو اگر علیحدہ کردیا گیا تو روح کا شیرازہ پریشان اور زندگی بے کیف
ہو جائیگی -

نوٹ—اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے :—

۱—بانگ درا—سر محمد اقبال -

۲—شعرالعجم—شبلی نعمانی -

۳—موازنہ انیس و دبیر—شبلی نعمانی -

۴—عمر خیام—سید سلیمان ندوی -

۵—نوجوان ورتھر کی داستان غم—گوئٹے - (مترجمہ ریاض الحسن)

6. Mind and Reality—LORD HALDANE.
7. Mind and its Working—C. E. M. JOAD.
8. A. B. C. of Psychology—C. K. OGDEN.
9. My Life—ISADORA DUNCAN.
10. Dance of Life—HAVELCOK ELLIS.
11. The Essence of Aesthetic—B. CROCE.
12. Aesthetic—B. CROCE.
13. Encyclopaedia Britannica (Article on Aesthetics)—B. CROCE.
14. Towards a Theory of Art—L. ABERCROMBIE.
15. A Study in Aesthetics—L. A. REID.
16. Three Lectures on Aesthetic—B. BOSANQUET.
17. Oxford Lectures on Poetry—A. C. BRADLEY.
18. An Idealist View of Life—S. RADHAKRISHNAN.